آفتاب ہجویر
پیام شاہجہانپوری

{ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ المعروف بہ گنج بخش کی
زندگی — اور تعلیمات — و — ارشادات }

پیام شاہجہانپوری

★ بار اوّل ★ تعداد ۲۰۰۰

قیمت

۲ روپے

ماہ اپریل ——— ۱۹۶۳ء

★ طابع ——— ملک سراج الدین

★ مطبوعہ ——— علمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور

○

مقامِ اشاعت

ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز۔ کشمیری بازار

لاہور (۸)

حرفِ آغاز

جس طرح کسی ملک کا نظام قائم رکھنے کے لئے ایک سربراہِ مملکت مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ سربراہِ مملکت نظم و نسق چلانے کے لئے اپنے ملک کو مختلف صوبوں میں تقسیم کرتا اور ہر صوبہ پر ایک گورنر مقرر کرتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں ایک روحانی نظام بھی ہے۔ اس نظام کو قائم رکھنے کے لئے احکم الحاکمین اپنے نائب مقرر فرماتا ہے۔ اس کے یہ نائب حالات کے مطابق کبھی انبیاء کبھی خلفاء اور کبھی اولیاء ہوتے ہیں۔ اس روحانی نظام کو جاری رکھنے کے لئے یہ اولیاء مختلف علاقوں میں اپنے خلفا مقرر کرتے ہیں۔ اس طرح ساری دنیا ایک روحانی رشتہ میں منسلک ہو جاتی ہے۔

اگر دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب دنیوی نظام کے پہلو بہ پہلو

روحانی نظام موجود نہ رہا ہو اور یہ نظام دنیوی نظام کے مقابلے میں کہیں زیادہ مکمل اور مثالی ہوتا ہے۔ دنیوی نظام میں قدم قدم پر بدعنوانیوں غلط کاریوں، ظلم وتعدی اور حصولِ اقتدار کے لئے کشت وخون ریزی کے نشانات ملیں گے۔ اس نظام میں لوگوں کو قوت کے زور سے اپنا مطیع وفرمانبردار بنانے کی بے شمار مثالیں نظر آئیں گی۔ مگر روحانی نظام میں قسم کھانے کے لئے بھی ایک واقعہ ایسا نہ ملے گا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اس نظام کے کسی رکن نے کسی ایک شخص کو بھی اپنا مطیع بنانے کے لئے طاقت کا استعمال کیا، بلکہ یہاں تو ہر شخص نقدِ جان لئے خود بخود حاضر ہوتا ہے۔ دنیوی نظام میں اکثر صرف جسموں پر حکومت کی جاتی رہی ہے اور دلی اطاعت سے منحرف رہے ہیں، مگر روحانی نظام میں جسم کے ساتھ ساتھ دل اور دماغ نے بھی ہمیشہ اطاعت گزاری کی ہے۔

حضرت مخدوم سید ابوالحسن علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ بھی کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں اسی روحانی نظام کے رکنِ رکین تھے جنھیں ان کے مرشد نے علاقہ پنجاب میں اپنا روحانی خلیفہ مقرر کرکے بھیجا تھا تاکہ وہ اس خطۂ ارض میں بھی اس نظام کو قائم کریں جو انسان کو ساری بارگاہوں سے بے نیاز کرکے احکم الحاکمین کی بارگاہِ اقدس میں سربسجود کرتا ہے آپؒ نے جن ناخوشگوار حالات میں اپنا فرض ادا کیا۔ اس کا اندازہ آج کے

لوگ کسی طرح نہیں کر سکتے اور نہ اُس قلبِ مضطرب کی تڑپ محسوس کر سکتے ہیں، جو اس سینۂ پُر نور میں لرزاں و تپاں تھا۔ افسوس کہ اسلام کے اس بہادر سپاہی کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کی طرف بہت کم توجہ کی گئی اور اس کی زندگی کے ضروری کوائف بھی تاریخ کے صفحات میں بہت کم محفوظ ہے۔ جبکہ اسی دَور کے سلاطین کی رزم آرائیوں اور بزم طرازیوں کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ حالانکہ برصغیر میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام سلاطین کی شوکت و جبروت نے نہیں بلکہ انھیں بوریہ نشینوں کے فقر و فاقہ نے کیا جن کے معدے اکثر اوقات غذا سے اسی طرح تہی ہوتے تھے جیسے مفلس کا چراغ تیل سے خالی ہوتا ہے۔ ان کے پاس نہ دُنیوی جاہ و جلال تھا اور نہ ایسے وسائل جنھیں وہ حصولِ مقصد کے لئے استعمال کرتے۔ مگر ان کے پاس وہ جوہر ضرور تھا جس کی آب و تاب تاریکی میں روشنی کی شاہراہ بناتی چلی جاتی ہے، وہ جوہر کیا تھا؟ ایمان و ایقان کی دولت، مقصد کی لگن اور اخلاقِ فاضلہ کے گوہرِ آبدار جنھیں دیکھ کر ہزاروں افراد اسلام کی صداقت پر ایمان لے آتے تھے۔

ان کی بلندیٔ کردار اور عظیم کارناموں کو دیکھتے ہوتے تاریخ نگاروں اور تذکرہ نویسوں کا فرض تھا کہ وہ ان قدسی نفس بزرگوں کی زندگی کا ایک ایک واقعہ صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر جاتے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور آج

جب کوئی سیرت نگار اُن کی حیاتِ گم شدہ کی مختلف کڑیاں جمع کرنی چاہتا ہے تو اُسے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی دشواری اس کتاب کے مؤلف کو بھی پیش آئی اور حضرت ابوالحسن علی ہجویریؒ کی زندگی کی حقیقی تصویر دکھانے کے لئے اسے بڑی تگ و دو کرنی پڑی۔ بہر حال جس طرح بھی ہو سکا اُردو، فارسی اور انگریزی کی مختلف کتابوں میں آپ کی زندگی کے متعلق جو حالات بکھرے پڑے ہیں، انھیں چن کر اور ریزہ ریزہ جمع کر کے اس کتاب کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب جس کا نام "**آفتابِ ہجویر**" ہے، تین ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا باب "سوانح" پر مشتمل ہے جس میں آپ کے نام و نسب اور جائے پیدائش، خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، آپ کے اساتذہ آپ کے مرشد، آپ کی شادی، سیر و سیاحت، لاہور کو روانگی اور لاہور میں آپ کے پیش رو بزرگوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے باب کا عنوان "ورودِ لاہور" ہے، اس میں آپ کی آمد سے پہلے پنجاب کے جو سیاسی حالات تھے۔ اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ اس عہد کی سیاسی تاریخ نگاہوں کے سامنے آجائے اور معلوم ہو سکے کہ آپ نے کن حالات میں اپنا فرض ادا کیا۔ اس کے بعد آپ کی تبلیغی مساعی جمیلہ کا بیان ہے۔ پھر آپ کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں آپ کی وفات

اور آپ کے مزار پُر انوار کی ضروری تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب کے تیسرے باب کا عنوان "افکار و نظریات" ہے۔ اس باب میں آپ کی تعلیمات و ارشادات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ باب آپ کی مشہور کتاب کشف المحجوب سے ماخوذ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کشف المحجوب میں آپ نے اپنے خیالات کا اظہار فارسی میں کیا ہے۔ اور میں نے انھیں اُردو میں بیان کر دیا ہے، ایک ہی مسئلہ کے متعلق آپ نے جو باتیں مختلف ابواب میں بیان کی ہیں، میں نے انھیں چُن چُن کر یک جا کر دیا ہے، آپ نے جو باتیں تفصیل سے بیان کی ہیں، میں نے انھیں مختصر کر دیا ہے۔ تاکہ جو لوگ طویل بیانات پڑھنے سے گھبراتے ہیں وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میں نے اس باب میں کشف المحجوب کے تمام ابواب کا خلاصہ درج نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اُن ابواب میں سے بیشتر ابواب کا خلاصہ بیان کیا ہے جو تصوف سے متعلق ہیں۔ بعض چیزیں جو ہمارے عام اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں میں نے وہ بھی اس میں شامل کر لی ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں میں نے اُردو، فارسی اور انگریزی کی جن قدیم و جدید کتابوں سے مدد لی ہے، ان میں سے ہر کتاب کا نام اور صفحہ کا حوالہ دے دیا ہے تاکہ کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے نہ رہے۔ آخر میں میں اپنے مہربان قدیم اور فاضل بزرگ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ موصوف نے اپنی ذاتی لائبریری سے بھی اور اپنے دوستوں سے بھی بعض قیمتی کتابیں حاصل کر کے مجھے عنایت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ ہاں آخر میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ میں نے حضرت علی ہجویریؒ کی زندگی، آپ کی شخصیت اور علمی کمالات پر جو کچھ لکھا ہے اس نقطۂ نگاہ سے لکھا ہے کہ موجودہ دَور سائنس کا دَور ہے اس دور میں عجائب پسندی کو کم اور حقیقت پسندی کو زیادہ دخل ہے اسلئے میں نے اس میں افسانہ طرازی اور خارق عادات واقعات کے بجائے حضرت علی ہجویریؒ کی زندگی کے عملی اور علمی پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور میری معلومات کے مطابق خود حضرت علی ہجویری نے بھی خارق عادات واقعات کے اظہار کو ناپسند فرمایا ہے۔ اُمید ہے کہ میں نے یہ کتاب جس جذبہ سے لکھی ہے اسی جذبہ سے پڑھی جائے گی ـــ!

پیام شاہجہانپوری

لاہور، ۳ نومبر ۱۹۶۲ء

سوانح

صفحہ ۱۷ تا صفحہ ۴۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
(۱)	نام و نسب اور مولد	۱۷
(۲)	آپؒ کا خاندان	۱۸
(۳)	تعلیم و تربیت	۱۹
(۴)	آپؒ کے اساتذہ	۱۹
(۵)	شیخ ابوالقاسم گرگانی رح	۲۱
(۶)	ابوالعباس اشقانی رح	۲۳
(۷)	ابوالعباس بن قصابؒ	۲۴
(۸)	خواجہ ابواحمد مظفر رح	۲۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
(۹)	آپؒ کے مرشد	۲۷
(۱۰)	مرشد کی وفات	۳۱
(۱۱)	شادی	۳۲
(۱۲)	سیر و سیاحت	۳۳
(۱۳)	مشاہدات	۳۴
(۱۴)	انکشافِ راز	۳۵
(۱۵)	مقامِ ابو حنیفہ رح	۳۶
(۱۶)	ایثار کی تعریف	۳۷
(۱۷)	سخاوت میں اعتدال	۳۹
(۱۸)	درویشی اور لذائذ دنیوی	۴۰
(۱۹)	غیب و حضور	۴۱
(۲۰)	لاہور کو روانگی	۴۲
(۲۱)	حضرت شاہ حسین زنجانی رح	۴۳
(۲۲)	شیخ اسماعیل لاہوری رح	۴۶

ورودِ لاہور

صفحہ ۴۹ تا صفحہ ۹۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
(۲۳)	آپ کی آمد سے قبل پنجاب کی حالت	۴۹
(۲۴)	حضرتِ علی ہجویریؒ کی لاہور میں آمد	۵۸
(۲۵)	شیخ حسام الدین لاہوریؒ سے ملاقات	۵۹
(۲۶)	آپؒ کی تبلیغی مساعی	۶۲
(۲۷)	تعمیرِ مسجد	۶۴
(۲۸)	علم و فضل	۶۵
(۲۹)	تصانیف	۶۷
(۳۰)	پہلی تصنیف	۶۷
(۳۱)	منہاجُ الدین	۶۸
(۳۲)	البیان لاہل العیان	۶۹
(۳۳)	اسرار الخرق و المؤنیات	۷۰
(۳۴)	کشف الاسرار	۷۰
(۳۵)	بالرعایت بحقوق اللہ	۷۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
(۳۶)	کشف المحجوب	۷۲
(۳۷)	کشف المحجوب کے مندرجات پر ایک سرسری نظر	۷۳
(۳۸)	کشف المحجوب کے عنوانات	۷۷
(۳۹)	کشف المحجوب پر ایک عمومی تبصرہ	۸۰
(۴۰)	حضرت علی ہجویریؒ کی شاعری	۸۳
(۴۱)	حضرت علی ہجویریؒ کی سیرت	۸۴
(۴۲)	وفات	۸۶
(۴۳)	"گنج بخش" کا لقب ؟	۹۰
(۴۴)	حضرت علی ہجویریؒ کا مزار	۹۲

افکار و نظریات

صفحہ ۹۹ تا صفحہ ۱۵۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
(۴۵)	صوفی کی تعریف	۱۰۰
(۴۶)	معاملاتِ تصوّف	۱۰۱
(۴۷)	تصوّف اور گودڑی پوشی	۱۰۳
(۴۸)	مسئلہ سماع	۱۰۴

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
(۴۹)	شرائطِ سماع	۱۰۵
(۵۰)	وجد و رقص	۱۰۷
(۵۱)	تصوّف کے متعلق اقوالِ مشائخ	۱۰۹
(۵۲)	صوفیا کے فرقے	۱۱۲
(۵۳)	فرقۂ محاسبیہ	۱۱۳
(۵۴)	فرقۂ قصاری	۱۱۳
(۵۵)	فرقۂ طیفوریہ	۱۱۵
(۵۶)	فرقۂ جنیدی	۱۱۶
(۵۷)	فرقۂ نوری	۱۱۷
(۵۸)	فرقۂ سہیلیہ	۱۱۹
(۵۹)	فرقۂ حکیمیہ	۱۱۹
(۶۰)	فرقۂ خرازیہ	۱۲۰
(۶۱)	فرقۂ خفیفیہ	۱۲۰
(۶۲)	فرقۂ سیاریہ	۱۲۱
(۶۳)	فرقۂ حلولیہ	۱۲۲
(۶۴)	اصطلاحاتِ صوفیہ	۱۲۳
(۶۵)	قبض و بسط	۱۲۴

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
(۶۶)	انس و ہیبت	۱۲۵
(۶۷)	فنا و بقا	۱۲۵
(۶۸)	حال و مقام	۱۲۷
(۶۹)	سُکر و صَحو	۱۲۹
(۷۰)	نفی و اثبات	۱۳۰
(۷۱)	مسامرہ و محادثہ	۱۳۱
(۷۲)	یقین	۱۳۲
(۷۳)	علم و معرفت	۱۳۴
(۷۴)	قہر و لُطف	۱۳۵
(۷۵)	شریعت و حقیقت	۱۳۷
(۷۶)	اصطلاحات شریعت و حقیقت	۱۳۸
(۷۷)	عظمتِ علم	۱۴۴
(۷۸)	جُود و سخا	۱۴۶
(۷۹)	حقیقتِ نفس	۱۴۹

سوانح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانح

جن پاک نفس بزرگوں نے صنم کدۂ ہند میں توحید کے چراغ روشن کیے ان میں حضرت مخدوم سیّد ابو الحسن علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی و اسم گرامی ہمیشہ عزّت و احترام سے لیا جائے گا۔

نام و نسب اور مولد

آپ کا اسمِ مُبارک علی، والد ماجد کا نام عثمان اور دادا کا اسمِ گرامی علی تھا۔ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ نجیبُ الطرفین سیّد تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے سیّدنا حضرت امام حسنؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ افغانستان کے مشہور شہر غزنی کے ایک قریہ میں جس کا نام ہجویر تھا ۴۰۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اسی مناسبت سے

آپ کو ہجویری کہتے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ اسی قریہ کی رہنے والی تھیں، آپ کے والد گرامی غزنی ہی کے ایک دوسرے قریہ جلاب کے رہنے والے تھے اور آپ نے بھی اپنی عمر کا کچھ حصّہ اس قریہ میں گذارا، اس لئے آپ جلابی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ لیکن آپ کی زیادہ شہرت ہجویری کے نام سے ہوئی۔ اس لئے کہ اس قریہ کو آپ کی ولادت کا شرف حاصل ہے۔ اسی بنا پر آپ کو ہجویر سے بڑی محبّت تھی۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ :-

★ " میرے والد ماجد نے مجھے بتایا کہ میری پیدائش ہجویر میں ہوئی۔ اللہ تعالےٰ اسے آفات و حوادث اور ظالم بادشاہوں کے ظلم سے محفوظ رکھے "۔

آپ کا خاندان

آپ کا خاندان غزنی کے ممتاز خاندانوں میں سے تھا۔ اس خاندان میں بہت سے علماء فضلا اور روحانی بصیرت رکھنے والے لوگ پیدا ہوئے۔ خود آپ کی والدہ ماجدہ بڑی نیک نفس، عبادت گذار اور صاحبِ علم خاتون تھیں آپ کے ماموں غزنی کے جیّد علما اور اہل اللہ میں سے تھے اور ہزاروں لوگ آپ کے عقیدتمند تھے۔ آپ اپنی پاک باطنی اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے "تاجُ الاولیا" کے لقب سے مشہور تھے اور بے شمار لوگوں کے قلوب پر حکومت کرتے تھے، دارالشکوہ

لکھتا ہے کہ جب میں پہلی بار اپنے والد گرامی کے ساتھ افغانستان گیا تو حصول برکات کے لئے "حضرت تاج الاولیاءؒ" کے مزار پر بھی حاضری دی اور فاتحہ پڑھی اسی دارا شکوہ کا بیان ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کا خاندان زہد و ورع کے لئے سارے غزنی میں ممتاز تھا۔ (سفینۃ الاولیا)

تعلیم و تربیت

حضرت علی ہجویری نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ نہایت پاکیزہ اور روحانیت سے معمور تھا۔ ہر طرف علم کا ذکر اور معرفت کا چرچا تھا۔ جس قدسی نفس ماں کی آغوش میں آپ پروان چڑھے اس کی زبان ذکر الٰہی میں مصروف اور دل جلوۂ حق سے سرشار رہتا تھا۔ اس لئے آپ نے ابتدائے عمر ہی سے بڑی محتاط اور پاکیزہ زندگی گذاروں۔ عبادت کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا۔ نیک نفس والدین کی تربیت نے آپ کے اخلاق کو شروع ہی سے پاکیزگی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی آپ کو تعلیم کے لئے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ حروف شناسی کے بعد آپ نے قرآن حکیم پڑھا۔ اس کے بعد مختلف اساتذہ سے عربی و فارسی اور پھر علم حدیث، فقہ، تفسیر، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔

آپ کے اساتذہ

یہ غزنی کے شباب کا زمانہ تھا سلطان محمود غزنوی نے جو اس نام مانے

میں افغانستان کے تخت و تاج کو زینت دے رہا تھا غزنوی کو زر و جواہر کے ساتھ ساتھ دولتِ علم و فن سے بھی مالا مال کر دیا تھا، عرب، ایران، اصفہان اور ہندوستان سے ہر علم و فن کے ماہر غزنی میں آ آ کر جمع ہو رہے تھے اور اپنے کمال کی داد پا رہے تھے، حضرت علی ہجویری رح کو اس علمی و روحانی ماحول سے فائدہ اُٹھانے کا پُورا موقع ملا، اور آپ نے ان صاحبانِ کمال سے خُوب خُوب استفادہ کیا۔ ان میں سے بعض اساتذہ غزنی کے اور بعض دوسرے مقامات کے رہنے والے تھے جن سے آپ نے دورانِ سفر میں علمی و روحانی فیض حاصل کیا آپ کے اساتذہ میں سے شیخ ابو العباس احمد بن محمد اشقانی رح، شیخ ابو القاسم بن علی الگرگانی رح۔ ابو العباس احمد بن محمد القصاب رح۔ ابو عبد اللہ محمد بن علی المعروف بالداستانی رح۔ ابو سعید فضل اللہ بن محمد رح۔ ابو احمد المظفر رح بن احمد بن حمدان اور شیخ ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری رح کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، خود آپ نے بھی اپنے ان اساتذہ کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے اور جگہ بہ جگہ ان کے علم و فضل کا اعتراف فرمایا ہے، بعض تذکروں میں مشہور بزرگ شاعر حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رح کا نام بھی آپ کے اساتذہ کی فہرست میں درج ہے۔ ان میں سے اپنے بعض اُستادوں کا حال آپ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "کشف المحجوب" میں تحریر فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو القاسم بن علی گرگانی رح کے متعلق لکھتے ہیں:۔

شیخ ابو القاسم گرگانیؒ

یہ اپنے زمانے کے عدیم النظیر امام ہیں، رُوحانیت میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپ کے عہد کے جتنے بزرگ اور اہلِ تصوّف ہیں، وہ سب آپ سے رجوع کرتے ہیں، علم و فضل میں یگانہ ہیں۔ اپنے شاگردوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے اور انھیں روحانی مقامات سے گذارنے میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے آپ کے شاگردوں اور مُریدوں میں سے ہر شخص علم و فضل اور پاکبازی کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ آپ کا فرزند ابُو علی آپ کا صحیح جانشین ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کی عمر میں برکت فرمائے کہ بڑا اقابل، صدق گفتار اور پاک باطن لڑکا ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں آپ (ابوالقاسم گرگانیؒ) کی خدمت میں حاضر تھا اور اس فکر میں تھا کہ کسی طور سے اپنی باطنی کیفیت بیان کروں۔ میں نے جراءت کر کے اپنا حال کہنا شروع کیا۔ وہ میرے حالات نہایت توجہ اور دلچسپی سے سننے لگے۔ ان کا یہ التفات دیکھ کر نوجوانی میں جو کبر و نخوت کے جذبات ہوتے ہیں وہ مجھ پر غالب آگئے اور میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ یہ شخص کوچۂ معرفت کا مرد نہیں ہے بلکہ یہ اس راہ سے گذرا ہی نہیں اور شیوخ کے علوئے مرتبت سے بے خبر ہے۔ ورنہ یہ کبھی میرے جیسے خام کار کے ساتھ ایسے انکسار کا برتاؤ نہ کرتا۔ میں یہ خیال کر ہی رہا تھا کہ وہ کشف کے ذریعے سے میرے

ان متکبرانہ خیالات سے آگاہ ہو گئے اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے میرے باپ کے عزیز اور محبوب! اچھی طرح سمجھ لے کہ میری یہ انکساری اور تواضع صرف تیری ذات کے لئے نہیں ہے۔ اندرونی کیفیت اور سیرت میں تو اللہ تعالیٰ ہی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ میں تو انکساری اور خلق کا اظہار اس لئے کر رہا ہوں تاکہ میرے ہم جلیسوں اور مریدوں کی تربیت ہو اور وہ مجلس کے آداب اور ملاقات کے طریق سیکھیں اور حسن معاشرت سے آگاہ ہوں۔ میں نے اپنا یہ طریق کار صرف تیرے لئے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ اسے سب کے لئے عام کر دیا ہے"۔

میں نے شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کی یہ تقریر سنی تو بیہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے مجھ پر اپنی توجہ ڈالی اور جب مجھے ہوش آیا تو فرمانے لگے کہ۔
"بیٹے! طریقت کا نکتہ پوشیدہ یہی ہے کہ جس وقت مرشد چاہے اپنے مرید کو راہِ راست سے ہٹا دے، اور جب چاہے اس راہ پر گامزن کر دے۔ نفی اور اثبات دونوں کے رسمی خیالات وہم سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور خیالات کی قید ایسی چیز ہے کہ انسان اس سے رہا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ شرک کے غلط توہمات سے آزاد ہو جائے اور توحید کے عقیدہ کو پختہ کر کے حق تعالےٰ کی بندگی کرتا رہے۔ اپنے تمام دنیوی تعلقات کا رشتہ منقطع کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا رشتہ استوار کرے۔

اس واقعہ کے بعد شیخ ابو القاسم گرگانیؒ کے ساتھ میرا باطنی تعلق بڑا مضبوط ہو گیا اور راہِ طریقت کے بہت سے اسرار و رموز مجھ پر ظاہر ہوئے۔

{کشف المحجوب[1] صفحہ ۱۳۳ فارسی نسخہ مطبوعہ گلزار ہند اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۲۳ء}

ابو العباس اشقانیؒ

اپنے دوسرے اُستاد شیخ ابو العباس اشقانیؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اپنے زمانے کے امامِ یگانہ، اصول و فروع کے علم میں یکتا اور اہلِ تصوف کے اکابرین سے تھے، طریقت کی جس راہ پر وہ گامزن تھے۔ اس کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ فنا کا راستہ ہے، اور اسے مطلب کے لئے بڑی دشوار عبارت استعمال کرتے تھے، اور یہ ان کی تحریر کی خاصیت تھی۔ جہلاء کی ایک جماعت نے ان کی تقلید کرنی چاہی لیکن ایسی عبارت لکھی جس میں پراگندگی کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ مجھے اُن سے بہت انس تھا، اور وہ بھی میرے ساتھ دلی محبت کرتے تھے، بعض علوم میں نے انھیں سے حاصل کئے ہیں میں نے ان سے زیادہ علمی بصیرت رکھنے اور شرع کی پابندی کرنے والا اور کوئی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوائے آپ تمام موجودات سے قطع تعلق

[1] اس کتاب میں جہاں بھی کشف المحجوب کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں متذکرہ بالا نسخہ ہی مراد ہے (مؤلف)

کر چکے تھے اور ہمیشہ کہتے رہتے کہ " اشتہی عدماً لاوجود لہٗ " یعنی میں ایسے عدم کا طالب ہوں جو وجود نہ رکھتا ہو۔ کہا کرتے تھے کہ صرف اللہ جلّ شانہٗ ہے جس کی ہستی کے لئے عدم نہیں ہے۔ اس کے ملک کا اس میں کون سا نقصان ہے کہ اگر میں نیست ہو جاؤں اور وہ نیست ہستی نہ رکھتا ہو اور فنا کی صحت کا فوائے اصل یہی ہے"۔ [کشف المحجوب صفحہ ۱۳۲]

ابوالعبّاس بن قصابؒ

اپنے تیسرے استاد حضرت ابو العباس احمد بن محمد القصابؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ماوراءالنہر کے پرانے بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے کشف و کرامت، زہد و تقویٰ، صحت فراست اور احوال معنوی کی رفعت کے لحاظ سے بہت مشہور تھے طبرستان کے امام ابو سعید اللہ خیاطؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ پر اللہ کی خاص برکات سایہ کئے ہوئے تھیں، ان میں سے ایک کا میں نے بھی مشاہدہ کیا ہے اور وہ یہ کہ باوجودیکہ آپ کتابی علم نہیں رکھتے تھے۔ مگر علوم میں پایہ ایسا عالی تھا کہ جب ہم سے اصولِ دین اور معرفتِ توحید کی کوئی بات بھی حل نہ ہوتی اور ہم آپ کے پاس حلِ مشکل کے لئے جاتے تو باوجود اُمّی ہونے کے آپ اسے بڑی آسانی سے حل فرما دیتے۔ تصوّف اور اصولِ دین میں آپ بڑی پُر حکمت گفتگو فرماتے تھے، آپ اوائل عمر سے آخر وقت تک نہایت بلند کردار

اور نیک سیرت رہے، آپ کی کرامات کے متعلق بہت سی حکایتیں سنی ہیں جنھیں میں طوالت کے خوف سے قلم انداز کرتا ہوں۔ البتہ ایک حکایت سناتا ہوں۔

ایک روز ایک لڑکا اپنے اونٹ کی مہار تھامے آمل کے بازار سے گذر رہا تھا، اونٹ کی پیٹھ پر بوجھ بہت زیادہ تھا۔ اور ادھر بازار میں کیچڑ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اونٹ کا پیر پھسلا اور وہ گر پڑا۔ گرنے سے اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ ماجرا دیکھ کر لڑکا بیقرار ہوگیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر فریاد وزاری کرنے لگا، اسی اثنا میں شیخ ابو العباس بن قصابؒ بھی ادھر آنکلے، انھوں نے ماجرا دریافت کیا، لوگوں نے بتایا کہ اس کے اونٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ آپ نے اونٹ کی مہار پکڑ کر آسمان کی طرف منہ کیا اور بارگاہِ ایزدی میں التجا کی کہ اے مولا کریم! اس اونٹ کے پیر کو درست کردے تاکہ یہ چلنے پھرنے کے لائق ہوجائے اور اگر تو نہیں چاہتا کہ اس کا پیر درست ہو تو پھر میرے دل کو اس لڑکے کی آہ وبکا سے کیوں جلا رہا ہے ابھی آپ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اونٹ کھڑا ہو کر چلنے لگا۔

آپ نے بہت سے اقوال منسوب ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ اپنا رابطہ مضبوط رکھے۔ ایسے شخص کے دل کو ہمیشہ اطمینان رہے گا۔ اسے خوشی حاصل رہے گی۔ اس کی روح میں توانائی پیدا ہوجائے گی۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ سے منہ پھیر لے گا۔ وہ غم و آلام

میں مبتلا ہو جائے گا۔ [کشف المحجوب ص۱۲۷]

خواجہ ابو احمد مظفرؒ

اپنے چوتھے استاد حضرت خواجہ ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدانؒ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ بڑے پائے کے ولی طریقت تھے اور صاحب کرامت بھی تھے، فنا و بقا کے مسئلے پر آپ بڑی پُر حکمت گفتگو فرمایا کرتے تھے، حضرت ابو سعیدؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور خواجہ مظفرؒ کو مجاہدہ و ریاضت اور مشاہدۂ حق کی فضیلت سے سرفراز کیا گیا ہے، میں نے حضرت خواجہ ابو احمد مظفرؒ کو فرماتے سنا کہ لوگوں نے جو کچھ دشت نوردی کر کے حاصل کیا، وہ میں نے اپنی مسند پر بیٹھے بیٹھے حاصل کر لیا ہے، بعض لوگوں نے جن کے دماغوں میں کبر و نخوت ہے حضرتؒ کے اس دعوے کو مبنی بر غلطی قرار دیا۔ یہ ان کے اپنے فہم کا قصور ہے کیوں کہ اپنے احوالِ واقعی کا راست بازی سے بیان کرنا قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا، یہ ایسا فعل نہیں ہے جسے موضوعِ بحث بنایا جائے اور اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی جائے، یہ تو اللہ کے فضل و احسان کا اعتراف ہے اور حکمِ قرآن کے عین مطابق ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں سفر کرمان سے مضمحل ہو کر واپس آیا۔ جب

آپ کی خدمت میں پہنچا تو مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ "ابوالحسن! اپنی باطنی کیفیت بیان کرو"۔ میں نے عرض کیا کہ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ محفلِ سماع منعقد ہو، چنانچہ آپ نے فوراً قوالوں کو طلب کیا رقص کرنے والوں کا بھی ایک گروہ آ گیا۔ نوجوانی کا زمانہ تھا، طبیعت میں گرمی بھی اور ذوقِ سماع شباب پر تھا، اس لئے مجھے بڑا لطف آیا، اور وجد کی کیفیت طاری ہو گئی تو آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا کیفیت گذری، میں نے عرض کیا کہ "اے شیخ! بہت سرور حاصل ہوا"۔ آپ نے فرمایا کہ یہ علامت ہے خام کاری اور ناپختگی کی، کچھ عرصے کے بعد تجھ پر ایک ایسا دور بھی آئے گا، جب قوالوں کی آواز اور کوّے کی صدا میں تجھے کوئی فرق محسوس نہ ہو گا یہ اس لئے کہ گانے کی خواہش صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک جلوۂ حق نظروں سے اوجھل رہتا ہے، جس وقت فقیر جلوۂ حق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے، اور طبیعت کی ناپختگی جاتی رہتی ہے تو اسے سماع بے مزہ معلوم ہونے لگتا ہے، پس تجھے چاہیئے کہ گانے کو اپنی عادت میں شامل نہ کرے، ورنہ ذاتِ حق کے مشاہدے سے محروم رہ جائے گا۔ [کشف المحجوب ص ۳۳]

آپ کے مُرشد

حضرت مخدوم علی ہجویری غزنی کے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل

کرنیکے بعد اپنے وطن سے نکلے اور مزید تعلیم کیلئے مختلف دیار و ولایات کا سفر اختیار کیا۔

دوران سفر میں آپ کی ملاقات حضرت شیخ ابو الفضل محمد بن ختلیؒ سے ہوئی، آپ علاقۂ شام کے رہنے والے، اپنے زمانے کے جید عالم اور روحانی پیشوا تھے، اور طریقۂ جنیدیہ میں بیعت تھے حضرت علی ہجویریؒ ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے بے حد متاثر ہوئے اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

[خزینۃ الاصفیا۔ صفحہ ۲۳۱]

شیخ ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ حضرت شیخ ابو الحسن علی حصریؒ کے مرید تھے، آپ کا سلسلۂ بیعت یہ ہے: ——

حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ مرید حضرت شیخ ابو الحسن علی حصریؒ کے وہ مرید حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کے، وہ مرید حضرت جنید بغدادیؒ کے وہ مرید حضرت سری سقطیؒ کے، وہ مرید حضرت معروف کرخیؒ کے، وہ مرید حضرت داؤد طائی کے، وہ مرید حضرت حبیب عجمیؒ کے، وہ مرید حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے اور وہ مرید امیر المومنین سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے۔ اس طرح حضرت علی ہجویریؒ کا سلسلہ نسب اور بیعت دونوں طریقوں سے حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے اور یہ وہ شرف ہے جو کسی کو مل جائے تو وہ ثریا کا ہم پایہ بلکہ اس سے بھی اونچا ہو جائے۔

آپ (حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ) سات سال تک مخلوق سے قطع

تعلق کر کے پہاڑوں میں ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے۔ ظاہر پرستی سے آپ کو سخت نفرت تھی، اور ان درویشوں کو جو گودڑی پہنتے ہیں مگر جن کا باطن صاف نہ ہو آپ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان سے بہت سختی سے پیش آتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ اگر ولی کرامت کا اظہار نہ کرے تو اچھا ہے لیکن اگر کوئی کرامات کا اظہار کرے اور اُس سے صرف فائدہ خلق مدنظر ہو تو مضائقہ بھی نہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ، ان کا ذکر بڑی لذّت و سرور کے ساتھ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ علوم تصوّف اور تفسیر و حدیث کے بلند پایہ عالم تھے۔ میں طریقت میں انھیں سے بیعت ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں آپ سے زیادہ پُرہیبت اور بارُعب کوئی نہیں پایا۔ آپ کا ارشاد ہے کہ دُنیا بقدر ایک دن کے ہے اور ہماری حیثیت اس دنیا میں روزہ دار کی ہے۔ اس پُرحکمت تعلیم کی تشریح یہ ہے کہ ہمیں جو زندگی ملی ہے وہ نہایت مختصر ہے اس چند روزہ عمر میں جہاں تک ہو ان تمام امور سے اجتناب کرنا چاہیے، جن کی اللہ تعالیٰ نے مخالفت فرمائی ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے مرشد کے ہاتھ دُھلا رہا تھا۔ اسی دوران میں میرے دل میں خیال گذرا کہ جب تمام امور کا انحصار تقدیر پر ہے تو کیا ضرور ہے کہ میں اپنے آپ کو پیروں کا غلام بنا کر ان کی خدمت گذاری کرتا رہوں۔ ادھر میرے دل میں یہ خیال آیا۔ اور ادھر حضرت ابوالفضل ختلیؒ نے کشف

کے ذریعہ سے میری باطنی حالت معلوم کرلی، اور پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اس وقت تیرے دل میں جو خیال آیا ہے میں اس سے آگاہ ہوگیا ہوں، اے میرے بیٹے! اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم ایک سبب سے ہوتا ہے جب وہ چاہتا ہے کہ کسی شخص کو تخت و تاج کا وارث کرے تو پہلے اس میں اس کے سنبھالنے کی طاقت اور اہلیت پیدا کر دیتا ہے۔ پس اسی طرح جب وہ کسی کو منصبِ ولایت پر سرفراز کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے پہلے ذکر و فکر کی طرف مائل کرتا ہے، پھر اس کے دل کو اولیا اور صوفیا کی خدمت کی طرف پھیر دیتا ہے اور اس کی یہی خدمت اس کی ولایت کا سبب بن جاتی ہے"

(کشف المحجوب صفحہ ۱۳۱)

آپ خود بھی بہت کم غذا کھاتے تھے، اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی کم کھانے کی تاکید فرمایا کرتے تھے اسی طرح سوتے بھی کم تھے۔ اور مریدوں کو بھی کم خوابی کی ہدایت فرماتے تھے۔ بہت کم گفتگو کرتے تھے اور مریدوں کو بھی کم گوئی کی تاکید فرماتے تھے۔ لباس بھی بہت معمولی زیب تن فرماتے تھے، عام طور پر گودڑی نہیں پہنتے تھے۔ ایک بار ایک جامہ پہنا وہی جامہ برسوں آپ کے جسم پر رہا۔ اسی کو دھو کر زیب تن فرما لیتے تھے، جب کہیں پر سے پھٹ جاتا۔ اس میں پیوند لگا لیتے۔ کہتے ہیں کہ اس جامے میں اتنے پیوند لگے کہ اصل کپڑے کا نام و نشان باقی نہ رہا؛

مُرشد کی وفات

آپ نے خاصی طویل عمر پائی اور دمشق و بانیال کے درمیان پہاڑ کی چوٹی پر ایک گاؤں میں جس کا نام بیت الجن ہے انتقال فرما گئے. آپ کی وفات ۴۵۳ھ میں ہوئی۔ (خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۳۱)

انتقال کے وقت حضرت مخدوم علی ہجویریؒ آپ کے پاس موجود تھے، آپ اپنے مرشد کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"جس وقت حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ کا انتقال ہوا تو آپ کا سر میری گود میں تھا۔ اس وقت میرا دل سخت پریشان تھا جیسے کہ ایک دوست کی جدائی کے وقت دوسرے دوست کا ہوتا ہے. اسی دوران میں آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا" اے بیٹا! میں تمہیں اعتقاد کا مسئلہ سمجھاتا ہوں۔ اگر تم نے یہ مسئلہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تو ساری پریشانیوں سے نجات پا جاؤ گے، یاد رکھو دنیا میں لوگوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں اور جو واقعات پیش آتے ہیں ان سب کا فاعلِ حقیقی اللہ تعالےٰ ہی ہے۔ وہ اپنی مصلحت کے مطابق واقعات کو معرضِ ظہور میں لاتا ہے. اس لئے ہمیں ان پہ ناگواری کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ اور ہر واقعہ پر جو رونما

ہو راضی برضا رہنا چاہیے"۔ اتنا کہہ کر آپ کا مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ (کشف المحجوب صفحہ ۱۳۱)

شادی

"کشف المحجوب" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ نے دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ابتدائے جوانی میں ہوئی مگر وہ عفیفہ جلد ہی وفات پا گئی۔ اس کے انتقال کے بعد آپ نے گیارہ سال تک تجرّد کی زندگی بسر کی۔ گیارہ سال کے بعد والدین کے اصرار سے دوسرا نکاح کیا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ متاہل زندگی کو پسند نہیں کرتے تھے اور دونوں شادیاں آپ نے اپنے والدین کے حکم کی تعمیل میں کی تھیں، کشف المحجوب میں جہاں آپ نے اپنی شادیوں کا ذکر کیا ہے، وہاں کچھ اس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نکاح کو ایک آفت سمجھتے تھے مگر صرف ان لوگوں کے لئے جو کسی خاص مشن پر مامور ہوتے ہیں اور جن کی زندگی کا زیادہ حصّہ سفر و سیاحت میں گذرتا ہے، آپ کی دوسری بیوی بھی صرف ایک سال زندہ رہیں اور آپ جلد ہی اس بار سے سبکدوش ہو گئے۔ ان دونوں میں سے کسی نہ کسی بیوی کے بطن سے اولاد بھی پیدا ہوئی، کیونکہ آپکی کنیت "ابو الحسن" سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں فرزند تولد ہوا جس کا نام آپ نے حسن رکھا۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ بیٹا صغر سنی میں فوت ہو گیا۔ نکاح کے متعلق آپ ایک خاص نظریہ رکھتے تھے اور وہ یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے لئے نکاح مباح ہے، ان لوگوں پر نکاح فرض ہے جو اپنی نفسانی خواہشات پہ قابو نہ پا سکیں۔ ان لوگوں کے لئے سنت کی حیثیت رکھتا ہے جو اہل وعیال کے حقوق ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں،

سیر و سیاحت

حضرت مخدوم علی ہجویریؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سفر میں گذرا یہ سفر آپ نے دو مقاصد کے لئے اختیار کئے۔ پہلا مقصد تعلیمی تھا اور دوسرا مقصد تبلیغی۔ اس سیر و سفر کے دوران میں آپ ایران، عراق، شام، ترکی، عرب، ماوراء النہر، آذر بائیجان، خراسان، طبرستان، قہستان، کرمان، خوزستان اور ہندوستان کے سینکڑوں مقامات سے گذرے۔ اور بڑے بڑے علما اور اولیا کی صحبت سے مستفید ہوئے، صرف خراسان میں تین سو علما اور بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان بزرگوں میں شیخ احمد بخاریؒ۔ خواجہ رشید مظفرؒ، خواجہ شیخ احمد حمادیؒ، خواجہ ابوجعفر محمد بن علی الجوینی، شیخ ابوعبداللہ جنیدیؒ، شیخ ابوالعباس دامغانیؒ، شیخ ابوطاہر مکشوفؒ، شیخ قاسم سدسیؒ، شیخ ابوالحسن علی بن بکرانؒ، شیخ ابوالحسن ابن سبالیہؒ، خواجہ

علی بن الحسین السیرکانی، شیخ ابو اسحٰق بن شہریار، شیخ احمد بن شیخ خرقانی اور شیخ محمد زکی بن العلاء کے علم و فضل اور ان کے زہد و اتقا پر آپ نے کہیں اجمالاً اور کہیں قدرے تفصیلاً روشنی ڈالی ہے اور ان کی روحانی و علمی فضیلت کا اعتراف کیا ہے، اپنی اس سیاحت کو آپ نے کشف المحجوب میں قلم بند فرمایا ہے، اس سلسلے میں آپ نے بعض بڑے دلچسپ اور بعض بڑے پر حکمت و نصیحت آموز واقعات لکھے ہیں۔ یہ واقعات آپ کے تجربات کا نچوڑ ہیں اور اس قابل ہیں کہ ہر شخص ان کا مطالعہ کرے، ذیل میں آپ کے تجربات و مشاہدات کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

مشاہدات

ماوراء النہر میں میں نے فرقہ ملامیتہ کے ایک بزرگ کو دیکھا، جو ایسی کوئی چیز نہ کھاتے تھے جو دوسروں کے کھانے کے قابل ہو اور نہ ایسا کپڑا پہنتے تھے جو دوسروں کے استعمال میں آسکے، وہ صرف ایسی اشیائے خوردنی کھاتے تھے جو لوگ بیکار سمجھ کر پھینک دیا کرتے تھے، جیسے ترکاریوں کے پتّے، باسی ترکاریاں، ناقابل استعمال گاجریں، راستے میں پڑے ہوئے پھٹے کپڑے اور دھجیاں جنھیں اٹھا کر دھو لیتے تھے اور پھر سی کر گودڑی پہن لیتے تھے۔

انکشافِ راز

ایک بار میں ایک باطنی الجھن میں گرفتار ہوگیا۔ ایک روحانی راز تھا، جو مجھ پر منکشف نہیں ہوتا تھا۔ اس کے انکشاف کے لئے میں نے بڑی ریاضت کی مگر پھر بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس سے پیشتر بھی ایک بار ایسا ہوا تھا اور میں نے حل مشکل کے لئے حضرت ابو یزیدؒ کے مزار پر چلہ کشی کی تھی، اس چلہ کشی کے نتیجے میں میری وہ باطنی مشکل حل ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس بار بھی میں آپ کے مزار پر معتکف ہوگیا، لیکن تین ماہ تک اعتکاف میں بیٹھے رہنے کے باوجود مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس دوران میں روزانہ تین دفعہ نہاتا اور تین ہی دفعہ طہارت کرتا، کامیابی کی کوئی صورت نہ دیکھکر میں خراسان جانے کے لئے رختِ سفر باندھا، راہ میں ایک گاؤں میں قیام کیا، یہاں صوفیوں کا ایک گروہ مقیم تھا، یہ رسم پرست لوگ تھے۔ انھوں نے مجھے سادہ جامہ پہنے دیکھ کر کہا کہ یہ ہماری جماعت سے متعلق نہیں رکھتا اور واقعی میں ان کی جماعت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا، انھوں نے مجھے قیام کے لئے جو جگہ دی خود اس سے بلند جگہ پر قیام کیا، خود تو نہایت لذیذ و نفیس غذائیں کھائیں اور مجھے ایک سوکھی روٹی کھانے کو دی، وہ لوگ میرا مضحکہ اڑاتے، خربوزے کھاکر چھلکے مجھ پر پھینکتے۔ میں نے

اپنے دل میں کہا کہ اے مولا کریم اگر ان کا لباس (گودڑی) وہ نہ ہوتا جو تیرے دوستوں کا ہوتا ہے تو میں ان کی یہ زیادتی کسی صورت برداشت نہ کرتا، باوجودیکہ یہ رسم پرست صوفی مجھے ہدفِ طنز و ملامت بنا رہے تھے، لیکن انبیاء و اولیا کی ایک بہت بڑی سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے میرے دل کو بڑی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ اور اُس وقت مجھ پر یہ رازِ سربستہ کھُل گیا کہ بزرگانِ طریقت کم فہموں کی زیادتیاں کیوں برداشت کرتے ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا کہ ملامت برداشت کرنا بھی روحانی مدارج کی بلندی کا زینہ ہے۔ اور اس میں بھی بڑے مفادات ہیں۔

مقامِ ابُو حنیفہ رض

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں علاقۂ شام میں سفر کرتا ہوا حضرت بلال رض کے روضہ پر پہنچا، جب میری آنکھ لگ گئی تو میں نے اپنے آپ کو مکہ معظمہ میں دیکھا۔ اتنے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بنی شیبہ کے دروازے پر تشریف فرما ہوئے، اس وقت آپؐ ایک سن رسیدہ شخص کو اس طرح بغل میں لئے ہوئے تھے جیسے کوئی کسی بچے کو لئے ہوتا ہے۔ میں فرطِ محبت سے بے قرار ہو کر آپ کی طرف دوڑا اور آپ کے پائے مبارک کو بوسہ دیا، میں بڑا حیران تھا کہ یہ ضعیف شخص کون ہے، کہ حضورؐ نے

قوتِ باطنی سے میرے اس استعجاب کا حال معلوم کر لیا۔ اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ "یہ تمہارے امام ہیں، امام ابو حنیفہ رضؓ"۔ اس سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت امام ابو حنیفہ رضؓ کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے اوصاف شرع کے قائم رہنے والے احکام کی طرح قائم و دائم ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضورؐ ان سے اسقدر محبت فرماتے ہیں۔ اور حضور کو جو ان سے ربط و محبت ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح آپؐ سے خطا کا ظہور ممکن نہیں، اسی طرح حضرت امام ابو حنیفہ رضؓ سے بھی خطا کا صدور نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک نکتۂ لطیف ہے جسے صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایثار کی تعریف

ایک روز میں نے احمد سرخسیؒ سے پوچھا کہ وہ کون سا سبب تھا جس نے تمہیں توبہ کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں سرخس کے جنگل میں مقیم تھا۔ اور میرا اونٹ بھی میرے ساتھ تھا، میرا طریقہ یہ تھا کہ میں اکثر اپنی روٹی حاجت مندوں کو دیدیا کرتا اور خود فاقہ کرتا۔ یہ طریقہ میں نے قرآن حکیم کی اس آیت کے پیش نظر اختیار کیا تھا۔

• وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

اسی اثنا میں ایک روز ایک شیر آیا، اس نے میرے اونٹ کو مار ڈالا مگر اسے کھایا نہیں، بلکہ جا کر ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گیا، اور زور زور سے دھاڑنے لگا، اس کے دھاڑنے کی آواز سن کر جنگل کے درندے اونٹ کے پاس جمع ہو گئے، اسے چیر پھاڑ کر کھانے لگے۔ جب وہ اپنے پیٹ بھر کر چلے گئے تو شیر نیچے اُترا۔ ابھی وہ شکار کے قریب پہنچا نہیں تھا کہ سامنے ایک لنگڑی لومڑی نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر شیر پھر واپس ہو گیا، مقصد یہ تھا کہ لومڑی بے خوف و خطر ہو کر گوشت کھا لے، لومڑی کے جانے کے بعد شیر اونٹ کے پاس آیا، اور تھوڑا سا گوشت کھا کر چل دیا۔ — جب وہ میرے قریب سے گذرا، تو اُس نے مجھے مخاطب کر کے رقت آمیز لہجے میں کہا[1] کہ "اے احمد! پیٹ بھرنے والی اشیا کا ایثار کر دینا تو چوپایوں اور درندوں کا وطیرہ ہے انسان کی ہمتِ عالی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ اس سے بلند چیز یعنی اپنی جان اپنے بھائیوں کی بہبودی میں قربان کر دے" یہ واقعہ

---

[1] اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شیر نے فارسی یا عربی زبان میں فصیح و بلیغ گفتگو شروع کر دی۔ بلکہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ شیر نے اپنے طرزِ عمل سے مجھے بتایا کہ انسان کو مال کی قربانی کر کے مغرور نہیں ہونا چاہئیے اور نہ اسے قربانی کی منتہیٰ سمجھنا چاہئیے۔ دیکھو! میں چوپایہ ہو کر ایثار سے کام لیتا ہوں۔ اگر تم اپنے آپ کو چوپایوں سے افضل ثابت کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہم جنسوں کی فلاح کے لئے مال سے زیادہ قیمتی چیز یعنی اپنی جان کی قربانی دو۔ (مؤلف)

دیکھ کر میں نے دنیا داری کے علائق چھوڑ کر اپنے آپ کو عبادتِ الٰہی اور بندگانِ خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دیا، اور یہی واقعہ میری توبہ کا سببِ اوّل ہے۔

سخاوت میں اعتدال

قیامِ عراق کے زمانے میں میں نے بہت زیادہ کشادہ دستی سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں قرض کے بوجھ تلے دب گیا۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی وہ مجھ سے طالبِ امداد ہوتا اور میں کسی نہ کسی طرح اس کی مدد کرتا، اس طرح لوگوں کے مطالبات روز بروز بڑھنے لگے، اور قرض خواہوں نے الگ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ عراق کے ایک سردار نے جو میرے اس حال سے واقف تھا مجھے لکھا کہ تو نے جو طریقِ کار اختیار کیا ہے اس سے پیدا شدہ پریشانیاں عبادت اور ذکرِ الٰہی میں مانع نہ ہو جائیں۔ یوں اندھا دُھند روپیہ خرچ کرنا اچھا نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کی ضروریات کے لئے بہت کافی ہے۔ اور اس کے سوائے کسی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ ہر بندے کی کفالت کر سکے"۔ میں نے اس نیک دل سردار کی اس پُر حکمت بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ اور اس تنگی سے چھٹکارا حاصل کیا۔

درویشی اور لذائذ دنیوی

مجھے شیخ ابومسلمؒ فارسی بن غالب فارسیؒ نے سنایا کہ ایک روز میں حضرت شیخ ابوسعیدؒ ابوالخیر فضل اللہ کی خدمت میں حصولِ برکات کے لئے حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپ ایک پیر پر دوسرا پیر رکھے بڑی شان سے تخت پر بیٹھے ہیں۔ پشت گاؤ تکیے سے لگی ہوئی ہے اور ایک نہایت قیمتی مکلّف چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے اپنی حالت پر غور کیا کہ کپڑے نہایت معمولی اور وہ بھی میلے۔ عبادت و ریاضت کی وجہ سے جسم نہایت نحیف و نزار اور نقاہت کی وجہ سے چہرہ کا رنگ زرد، اپنا اور ان کا مقابلہ کر کے مجھے ان سے بیزاری سی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ اس شان و شوکت سے زندگی گذارنے والا شخص ولی اللہ نہیں ہوسکتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت ابوالخیر فضل اللہ کو کشف کے ذریعہ سے میری باطنی حالت معلوم ہوگئی۔ چنانچہ آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اے ابومسلم تجھے کس ولی نے بتایا کہ از روئے شرع اچھی خوراک اور نفیس لباس استعمال کرنا ناجائز ہے۔ اور کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ جو درویش نفیس لباس پہن کر اور لذیذ غذا کھا کر متکبر ہوجائے وہ خدا اور اس کے نیک بندوں کے نزدیک درویش رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے فضل سے مجھے نعمتیں عطا فرمائیں

اور ان نعمتوں پر اس کی عدولی حکمی کرنے کی بجائے میں اس کا شکر بجالایا تو اللہ تعالےٰ نے مجھے تخت نشین کر دیا اور پہلے سے بھی زیادہ نعمتوں سے نوازا لیکن تو نے رہبانیت کا طریقہ اختیار کیا۔ اور اللہ تعالےٰ سے وہ چیزیں بھی نہ مانگی جن کا مانگنا جائز تھا، تو تجھے خاک نشینی اور میلے کچیلے کپڑوں کے سوائے اور کیا ملتا، مجھے اللہ تعالیٰ نے مشاہدہ کی نعمت عطا فرمائی اور تجھے صرف مجاہدہ نصیب ہوا۔ اور تجھے جاننا چاہیئے کہ مشاہدہ مجاہدہ سے بہت ارفع و اعلیٰ چیز ہے۔

شیخ ابو مسلمؒ نے مجھے سنایا، کہ حضرت ابوالخیرؒ فضل اللہ کا یہ ماجرا سن کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے، جب حواس بجا ہوئے تو میں نے اپنے اس خیال سے توبہ کی۔ اور آئندہ کے لئے عہد کیا کہ کسی کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس کے باطن کے متعلق کبھی کوئی حکم نہیں لگاؤں گا۔

غیب و حضور

ماورالنہر کے زمانہ قیام میں احمد حماد سرخسیؒ میرے ہم مجلس رہا کرتے تھے۔ ایک روز ان سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے نکاح کرنے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی، انھوں نے جواب دیا کہ زندگی میں مجھ پر دو ہی حالتیں وارد رہتی ہیں یا تو اپنے آپ سے غائب ہوتا ہوں یا حاضر

رہتا ہوں، جب غائب ہوتا ہوں تو مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں ہوتا۔ اور جب حاضر ہوتا ہوں تو مجھ پر شکر گذاری کی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ بظاہر معمولی چیز بھی اللہ تعالےٰ کی عظیم نعمت محسوس ہوتی ہے اور ایک روٹی پاکر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اللہ تعالےٰ نے مجھے ایک ہزار حوریں بخشدیں۔

لاہور کو روانگی

حضرت سید علی ہجویریؒ نے علوم ظاہری و باطنی میں جو کمال حاصل کیا تھا اور عالم اسلام کے علما و حکما اور بزرگانِ دین کی صحبت سے جو کسب فیض کیا تھا وقت آگیا تھا کہ اس سے خلق خدا کو استفادہ کرنے کا موقع دیا جاتا، چنانچہ آپکے مرشد حضرت ابوالفضل بن حسن ختلیؒ نے آپ کو حکم دیا کہ تم لاہور روانہ ہو جاؤ اور وہاں جاکر رُشد و ہدایت کا فریضہ انجام دو حضرت علی ہجویریؒ کے مرشد بھائی (حضرت ابُوالفضل بن حسن ختلیؒ کے ایک اور مرید) حضرت شاہ حسین زنجانیؒ پہلے سے لاہور میں موجود تھے اور اپنے وقت کے ولیٔ کامل تھے۔ اس لئے حضرت علی ہجویریؒ نے مُرشد کا حکم سُن کر دریافت کیا کہ پیر و مُرشد! وہاں تو حضرت حسین زنجانیؒ موجود ہیں۔ اور وہ قطب الاقطاب ہیں۔ پھر وہاں میری کیا ضرورت ہے۔ حضرت ابوالفضل بن حسن ختلیؒ نے فرمایا تھا کہ تمہیں اس سے کیا تم لاہور روانہ ہو جاؤ

وہاں تمہاری ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ مرشد کے حکم کی تعمیل میں لاہور روانہ ہو گئے، آپ کا قافلہ تین افراد پر مشتمل تھا، اور یہ تینوں درویش تھے۔ یعنی حضرت علی ہجویریؒ، شیخ احمد حمادی سرخسیؒ اور شیخ ابو سعید ہجویریؒ۔

[تحقیقاتِ چشتی صفحہ ۱۴۵]

حضرت شاہ حسین زنجانیؒ

حضرت شاہ حسین زنجانیؒ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ کے مرشد بھائی اور آپ کے پیش رو تھے، یعنی آپ کی لاہور میں تشریف آوری سے پہلے یہاں رشد و ہدایت کا فریضہ ادا کر رہے تھے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بھی مختصر حالات بیان کر دیئے جائیں۔

زنجان خراسان کا مشہور قصبہ ہے۔ جہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ اور اہلِ علم پیدا ہوئے۔ شیخ فرخ زنجانیؒ، حضرت سید یعقوب زنجانیؒ اور میر عبد العزیز زنجانیؒ اسی خاک پاک سے اُٹھے اور اپنے فضل و کمال کے وہ نقوش صفحۂ عالم پر چھوڑ گئے، جنھیں افلاک کی ہزاروں گردشیں بھی نہ مٹا سکیں۔ ان میں سے حضرت شیخ فرخ زنجانیؒ، حضرت سید یعقوب زنجانیؒ اور حضرت شاہ حسین زنجانیؒ آسمانِ ولایت پر تاباں و درخشاں ستاروں کی حیثیت سے طلوع ہوئے اور تینوں بزرگ لاہور کی خاک پاک میں آسودہ

خواب ہوئے۔ میر عبدالعزیز زنجانی رح آسمانِ علم و فضل پر مہر عالم تاب کی حیثیت سے ضوفشاں ہوئے اور شعر و ادب کے میدان کے مرد کہلائے۔ آپ نے مغل بادشاہ محمد شاہ کا زمانہ پایا، ان کے علمی کارناموں میں وہ فارسی قصیدہ بڑا مشہور ہے جو انھوں نے عرفی کے قصیدہ کا تتبع کرتے ہوئے لاہور کے متعلق لکھا تھا۔

زنجان کے ان بزرگوں اور اہلِ علم و فضل میں حضرت شاہ حسین زنجانی کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ ۳۹۰ھ اور ۴۰۰ھ کے درمیان صوفیائے اکرام کی ایک جماعت کے ساتھ زنجان سے لاہور تشریف لائے اور یہیں مقیم ہوگئے، آپ کے ہمراہ حضرت سید یعقوب زنجانی رح بھی تھے جو صدر دیوان کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت شاہ حسین زنجانی رح اور حضرت سیّد یعقوب زنجانی رح دونوں علوم ظاہری و باطنی میں کامل اور زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ اس سرزمین پر وارد ہونے والے پہلے مبلغ اسلام تھے جنھوں نے تلوار سے نہیں بلکہ دلائل و براہین سے اسلام کی اشاعت کی۔ آپ کے زہد و تقویٰ اور اخلاقِ عالیہ سے متاثر ہو کر لاہور کے ہزاروں غیر مسلم آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئے۔ آپ کم و بیش پینتیس چھتیس سال لاہور میں مقیم رہے۔ اور ۴۳۱ھ میں انتقال فرما گئے۔ لاہور[1] کے علاوہ آپ نے ہندوستان کے اور بھی بہت سے شہروں اور صوبوں کی سیاحت کی۔

[[1] تاریخ لاہور صـ ۲۷۸]

موضع چاہ میراں میں آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ کا مزار ایک وسیع وعریض باغ میں ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سکھوں کے عہدِ حکومت میں لگایا گیا تھا۔ جس وقت حضرت علی ہجویریؒ لاہور میں داخل ہوئے ہیں تو حضرت شاہ حسین زنجانیؒ کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس وقت حضرت علی ہجویریؒ پر آپ کے مرشد کے اس حکم کی حکمت منکشف ہوئی جس کے مطابق آپ نے حضرت علی ہجویریؒ کو لاہور جانے کی ہدایت کی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ وہاں تمہاری ضرورت ہے

حضرت نظام الدین اولیاؒ شیخ حسینؒ زنجانی کے انتقال اور حضرت علی ہجویری کی لاہور میں تشریف آوری کے متعلق لکھتے ہیں:

"شیخ حسین زنجانیؒ اور شیخ علی ہجویریؒ دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت تھے۔ ان میں سے شیخ حسین زنجانی رح بہت عرصے سے لاہور میں مقیم تھے' کچھ عرصے کے بعد آپ کے مرشد نے حضرت علی ہجویریؒ سے ارشاد فرمایا کہ تم لاہور جاؤ اور وہیں ٹھہرو۔ اس پر حضرت علی ہجویریؒ نے عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین زنجانی موجود ہیں۔ آپ نے دوبارہ فرمایا کہ تم لاہور جاؤ۔ جب حضرت علی ہجویریؒ مرشد کے حکم کی تعمیل میں لاہور آئے تو رات کا وقت تھا (اس لئے آپ نے رات کا باقی حصہ شہر کے باہر گذارا) جب صبح ہوئی اور آپ شہر میں داخل ہوئے تو شیخ حسینؒ زنجانی کا جنازہ نکل رہا تھا۔"

[فوائد الفواد صفحہ ۳۵]

شیخ اسماعیلؒ لاہوری

حضرت علی ہجویریؒ کے دوسرے پیش رو حضرت شیخ محمد اسماعیلؒ لاہوری تھے۔ بلکہ "تاریخی کتابوں میں سب سے پہلے جن مبلغِ اسلام کا نام آتا ہے، وہ شیخ محمد اسماعیل لاہوری ہیں جو یہاں اس زمانے میں آئے جب لاہور میں ایک ہندو راجہ حکمراں تھا۔ وہ شاید سلطان محمود غزنوی کو خراج دیتا تھا۔ لیکن سلطان نے ابھی لاہور میں اپنا نائب مقرر نہیں کیا تھا، شیخ اسماعیلؒ بخاری سید تھے، اور علوم ظاہری و باطنی دونوں میں دسترس رکھتے تھے، ان کی نسبت لکھا ہے کہ واعظینِ اسلام میں وہ سب سے پہلے بزرگ تھے جنھوں نے لاہور کے شہر میں جہاں وہ ۱۰۰۵ء میں آئے تھے وعظ کیا۔ ان کی مجلسِ وعظ میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا۔ اور ہر روز صدہا لوگ خلعتِ اسلام سے مشرف ہوتے تھے"۔ [آب کوثر صفحہ ۸۴۔ از شیخ محمد اکرام]

- "کہا جاتا ہے کہ صرف ایک روز میں آپ کے دستِ حق پرست پر ایک ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا"۔

[خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۳۰]

- "آپ نے ۴۴۸ھ میں وفات پائی اور لاہور میں دفن ہوئے"۔

[خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۳]

ورودِ لاہور

ورودِ لاہور

آپؒ کی آمد سے قبل پنجاب کی سیاسی حالت

چوتھی صدی ہجری سابق پنجاب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے یہی وہ صدی ہے جب اس خطہ پر اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اور یہ صنم کدۂ قدیم نعرۂ توحید سے گونج اٹھا۔ یوں تو سرزمین پاک و ہند کے اُس حصّے پر جسے سندھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے اسلام کا علم لہرا دیا تھا۔ مگر پانچ دریاؤں کا یہ خطہ حسن و رعنائی ابھی تک مسلمانوں کے بابرکت قدموں سے محروم تھا۔

۳۶۷ھ وہ تاریخی سال ہے جب مشہور مسلمان حکمران امیر سبکتگین نے اپنے گھوڑے کی باگ ہندوستان کی طرف موڑی اور فتح و نصرت کو اپنی جلو میں

لئے سابق پنجاب کے بعض مقامات تک یلغار کرتا ہوا آیا اور بقول مولانا ذکاء اللہؒ ہند کے چند قلعے ایسے فتح کئے کہ جہاں نہ اہلِ اسلام کے گھوڑوں کے سم نہ اونٹوں کے قدم پہنچے تھے، ان قلعوں میں جابجا مساجد بنا کر اور وہ مالِ غنیمت لے کر جو تاخت و تاراج سے ہاتھ لگا تھا غزنی کی طرف مراجعت کر گیا۔" (تاریخِ ہند جلد اوّل ص۲۴۵ از مولانا ذکاءُ اللہ)

اس زمانے میں لاہور سے ملتان اور کشمیر سے پشاور تک کے علاقے پر راجہ جے پال حکمراں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک مسلمان حکمراں نے اس کے علاقے پر حملہ کر کے اس کے بہت سے قلعے اور ان کا ملحقہ علاقہ فتح کر لیا ہے تو اُسے سخت تشویش پیدا ہوئی اور اس نے اپنی ساری طاقت مجتمع کر کے ایک فیصلہ کن جنگ کا منصوبہ بنایا۔ اُدھر غزنی میں امیر سبکتگین کو بھی راجہ جے پال کے ارادوں کی خبر ہوگئی۔ اور اس نے ایک لشکر جرار کے ساتھ پشاور کی طرف کوچ کر دیا۔

لمغان کے میدان میں کہ کابل اور پشاور کے درمیان واقع تھا دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ فاتح سومنات سلطان محمود غزنوی بھی اس جنگ میں اپنے والد گرامی کے ہم رکاب تھا۔ طویل جنگ کے بعد راجہ جے پال نے امیر سبکتگین کی خدمت میں صلح کا پیغام بھیجا۔ امیر سبکتگین نے اس شرط پر صلح منظور کر لی کہ راجہ جے پال اپنے دربار کے چند امراء اور کچھ قریبی

رشتہ داروں کو بہ طور یرغمال اس کے حوالے کر دے اور ہندوستان واپس جاکر تاوانِ جنگ کے طور پر زر و جواہر اور ہاتھی گھوڑوں کی مقرر تعداد امیر موصوف کی خدمت میں ارسال کرے۔

اس قول و قرار کے بعد راجہ جے پال اپنے شکست خوردہ لشکر کو لے کر دار السلطنت بھٹنڈہ واپس آگیا۔ یہاں آکر اس کی نیت میں فتور پیدا ہو گیا اور اس نے امیر سبکتگین کے ان امراء کو قید کر لیا جو اس سے تاوانِ جنگ وصول کرنے آئے تھے، جب امیر سبکتگین کے پاس جے پال کی طرف سے تاوانِ جنگ نہ پہنچا اور اسے راجہ کی عہد شکنی کی اطلاع ہوئی تو وہ غضبناک ہو کر ہندوستان پر چڑھ آیا۔ افغانوں کی جمعیت کثیر کے ساتھ اُس نے ہندوستان کے سرحدی مقامات پر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا اور شہر پر شہر فتح کرتا ہوا پنجاب کی طرف بڑھنے لگا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر راجہ جے پال نے ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کو لکھا کہ امیر سبکتگین بھارت ماتا کی آبرو پامال کرتا ہوا پنجاب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر اُس نے پنجاب فتح کر لیا تو آپ لوگوں کی آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس لئے اپنے اس مشترک دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ فوجیں اور سامانِ رسد میری امداد کے لئے بھجوائیے۔

ہندوستان کے تمام بڑے بڑے راجا جو امیر سبکتگین کی یلغار اور راجہ

جے پال کی شکست کی خبر سن کر پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے ایک دوسرے کے دشمن ہونے کے باوجود جے پال کی امداد کے لئے کمربستہ ہوگئے اور دلّی، اجمیر، کالپی اور قنوج کے راجاؤں نے اپنی ٹڈی دل فوجیں سامان رسد کے ساتھ پنجاب کی طرف روانہ کردیں، اس طرح ایک لاکھ سورماؤں[1] کا لشکر جے پال کے جھنڈے تلے جمع ہوگیا۔

اس لشکرِ عظیم کو لے کر راجہ جے پال امیر سبکتگین کے مقابلے کیلئے نکلا۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو امیر سبکتگین نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر دشمن کی فوجوں پر ایک نظر ڈالی۔ دیکھا کہ حدِ نگاہ تک انسانی سروں کا سمندر موجزن ہے۔ پھر اپنی فوجوں کو دیکھا تو چند ہزار افغانوں کے سوائے اور کچھ نہ تھا، مگر یہ منظر دیکھ کر اس کی قوّتِ ایمانی میں کوئی کمی نہ آئی، اس نے اس ٹڈی دل لشکر کو بھیڑیں اور بکریاں اور خود کو قصاب سمجھا۔ اپنی فوج کے سرداروں کو جمع کرکے اس نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس نے اس کی فوج کے دل بڑھا دیئے اور وہ سب مارنے مرنے کو تیار ہوگئے۔

امیر سبکتگین صاحب ہمّت ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تدبیر بھی تھا چنانچہ اس نے پانچ پانچ سو سواروں کا ایک ایک دستہ مرتب کرکے ایک ایک

---

[1] تاریخِ فرشتہ جلد اوّل صفحہ (۲۰)

آزمودہ کار افغان سردار کو اس کا سپہ سالار بنایا، اور حکم دیا کہ یہ سارے دستے دشمن پر یکدم حملہ نہ کریں بلکہ ایک دستہ حملہ کرے اور باقی دستے حملے کا انتظار کریں۔ اس طرح امیر سبکتگین کی فوجوں نے راجہ جے پال کی فوجوں کو تھکا تھکا کر ان کا ناک میں دم کر دیا۔ ایک دستہ جے پال کی فوج پر حملہ کرتا، جب وہ ہٹتا تو جے پال کی فوجیں سمجھتیں کہ افغان ہمّت ہار گئے کہ اتنے میں دوسرا دستہ نمودار ہوتا، جب وہ تھک جاتا تو تیسرا دستہ اس کی جگہ پر آجاتا۔

چند روز کی جنگ کے بعد جب جے پال کی فوجوں میں کمزوری کے آثار پیدا ہونے لگے تو امیر سبکتگین نے اپنے لشکر کو حملۂ عام کا حکم دیا۔ اس اچانک اور پُرزور حملے سے ہندو فوجوں کے پیر اکھڑ گئے، اور وہ سراسیمہ ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلیں اور امیر سبکتگین کی فوجوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر مولی گاجر کی طرح کاٹنا شروع کر دیا، اور افغان مفرور فوج کا تعاقب کرتے ہوتے دریائے اٹک تک آگے بڑھ آئے اور آگے بڑھ کر پنجاب کے بہت سے حصّہ پر قبضہ کر لیا۔

۳۸۷ھ میں امیر سبکتگین کے انتقال کے بعد اس کا اقبال مند بیٹا سلطان محمود غزنوی تختِ غزنی پر متمکن ہوا، کچھ عرصے تک تو وہ خانہ جنگی میں مبتلا رہا، اپنی تخت نشینی کے تین سال بعد یعنی ۳۹۰ھ میں اُس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس دوران میں راجہ جے پال نے امیر سبکتگین کے مفتوحہ

علاقے واپس لے لئے تھے۔ چنانچہ محمود غزنوی نے پہلے حملے میں سرحدی قلعوں پر قبضہ کرلیا، دُوسرا حملہ اس نے ۳۹۱ھ میں کیا اور دس ہزار منتخب بہادروں کے ساتھ سرزمین ہند میں داخل ہُوا۔

پشاور کے قریب بارہ ہزار سواروں اور تیس ہزار پیادہ فوج کے ساتھ جے پال نے سلطان محمود غزنوی کو آگے بڑھنے سے روک دیا، سلطان نے اپنی فوجوں کو جو جے پال کی فوجوں کا چوتھائی حصّہ تھیں۔ اس قابلیت سے منظم و مرتب کیا کہ جے پال کا ٹڈی دَل لشکر ان کے سامنے چند روز بھی نہ ٹھہر سکا، اس جنگ میں جے پال کو عبرتناک شکست ہوئی اور وہ سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں اسیر ہو گیا۔

پشاور فتح کر کے سلطان محمود غزنوی پنجاب میں داخل ہُوا اور بھٹنڈہ پہنچ کر جے پال کے مشہور و مستحکم قلعے کو مسمار کر دیا، جے پال ایک قیدی کی حیثیت سے اس سفر میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ رہا۔ اور بھٹنڈہ میں اپنی آنکھوں سے اپنے قلعے کی تباہی دیکھتا رہا۔ بھٹنڈہ سے غزنی واپس جاتے ہوئے سلطان محمود نے جے پال اور اس کے عزیزوں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا۔ مگر جے پال اپنی اس بے عزّتی پر اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ جینے کی آرزو ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا، اور تخت و تاج اپنے بیٹے نند پال کے حوالے کر کے خود آگ میں جل مرا۔

۳۹۵ھ میں سلطان محمود غزنوی ملتان کے حاکم ابوالفتح کی گوشمالی کیلئے روانہ ہوا جس نے بعض مورخین کے بقول قرمطی مذہب[1] اختیار کر کے مسلمانوں میں کفر و الحاد پھیلانا شروع کر دیا تھا، اس زمانے میں دریائے سندھ برسات کی وجہ سے طغیانی پر تھا، اس لئے سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کے راجہ انندپال سے اجازت مانگی کہ وہ اسے اپنے علاقے سے گزر جانے دے، مگر راجہ انندپال نے اجازت دینے سے انکار کر دیا، اور سلطان کے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔

یہ دیکھ کر سلطان محمود غزنوی نے حاکم ملتان کی گوشمالی کا ارادہ ملتوی کر کے پہلے انندپال کی سرکوبی کا فیصلہ کیا۔ اور اس پر پے در پے حملے کرنا شروع کر دیئے۔ انندپال کو ہر معرکے میں شکست ہوتی اور وہ پیچھے ہٹتا ہوا جنگلوں میں جا چھپا، سلطان محمود غزنوی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر تنگ آکر انندپال پنجاب سے بھاگ کر کشمیر چلا گیا، اور وہیں روپوش ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان ملتان کی جانب متوجہ ہوا۔ اسی زمانے میں خراسان پر ایلک خاں نے حملہ کر دیا، اس لئے محمود غزنوی ملتان کی مہم کا چارج راجہ جے پال کے نواسے سکھ پال کو دے کر خراسان چلا گیا۔

ایلک خاں کو شکست دے کر جب سلطان محمود غزنی آیا تو اسے معلوم ہوا کہ راجہ سکھ پال جو مسلمان ہو چکا تھا مرتد ہو کر سرکشی و تمرد پر آمادہ ہے

---

[1] جدید تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ قدیم مورخین کا یہ بیان غلط ہے ابوالفتح صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ محمود غزنوی سے اس کی جنگ سیاسی نوعیت کی تھی (پیام)

چنانچہ وہ اس کی گوشمالی کے لئے پھر ہندوستان روانہ ہوا۔ راجہ انندپال کو بھی سلطان محمود غزنوی کی پیش قدمی کی اطلاع مل گئی۔ اور اس نے اجین، کالنجر، قنوج، دلی، اجمیر اور گوالیار کے راجاؤں کو امداد کے لئے لکھا۔ انندپال کے مراسلے پہنچتے ہی ان راجاؤں نے لشکر جمع کرنے شروع کر دیئے۔ سارے ملک میں اس جنگ کی تیاریوں کی تشہیر کی گئی۔ اور اسے مقدس اور مذہبی جنگ کا نام دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ہندو عورتوں نے اپنے زیور اتار کر دے دیئے، اور ان زیوروں کو گلا کر سکے ڈھالے گئے۔ بوڑھی عورتوں نے چرخے کات کات کر روپیہ حاصل کیا، اور یہ روپیہ اس جنگ کی تیاریوں کے لئے بہ طور امداد پیش کیا۔[1]

غرض ساز و سامان اور اسلحہ جنگ سے آراستہ و پیراستہ ایک ٹڈی دل لشکر بڑے جوش و خروش سے سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔

پشاور کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، اور ایک خونریز جنگ کے بعد انندپال کا لشکر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہزاروں ہندو اس لڑائی میں قتل ہوئے اور لاکھوں روپے کا مال غنیمت سلطان کے ہاتھ لگا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اوّل صفحہ (۳۶)

باوجودیکہ پنجاب کا ہندو راجہ سلطان محمود غزنوی سے عہد شکنی کر چکا تھا۔ لیکن سلطان نے اسے معاف کر کے اس کی حکومت بحال کر دی تھی۔ مگر جب دوسری بار اس نے عہد شکنی کی اور سلطان سے شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگا تو سلطان نے اس کے بیٹے جے پال ثانی کو پنجاب کا حکمران مقرر کر کے سلطنت اسی خاندان میں برقرار رکھی۔

جے پال ثانی نے بھی سلطان سے وفا نہ کی اور جب وہ کانگڑہ کے پہاڑی راجاؤں کی سرکوبی میں مصروف تھا تو جے پال ثانی نے علم بغاوت بلند کر دیا یہ خبر سن کر سلطان محمود غزنوی لاہور کی طرف روانہ ہوا اور شہر سے باہر جے پال ثانی کی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکہ میں بھی میدان سلطان ہی کے ہاتھ رہا۔ جے پال ثانی شہر سے فرار ہو گیا، اور لاہور پر سلطان محمود غزنوی نے قبضہ کر لیا۔ [تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۱]

اس طرح لاہور اور لاہور کے ساتھ پنجاب باقاعدہ سلطان محمود غزنوی کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اور سلطان کا مقرب خاص غلام ایاز پنجاب کا پہلا مسلمان گورنر مقرر ہوا۔ بعض تاریخوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے اپنے بیٹے امیر مجدود کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔

[تاریخ مسعودی صفحہ ۶۳۷]

جب تاریخ فرشتہ کا بیان اس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ

معلوم ہوتا ہے کہ امیر مجدود کو گورنر اور ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا بہر حال پنجاب سلطان محمود غزنوی کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ اور اس پر غزنوی امراء گورنر مقرر ہونے لگے۔

۱۴ ربیع الاوّل ۴۲۱ھ کو سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا امیر مسعود تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے نو سال بعد یعنی ۴۳۰ھ میں سلطان مسعود غزنوی ہندوستان آیا، اور یہاں کے بعض سرکش راجاؤں کی گوشمالی کی۔ اسی سفر میں اس نے ہانسی اور سونی پت کے قلعے فتح کئے اور مظفر و منصور ہو کر غزنی واپس چلا گیا۔

حضرت علی ہجویریؒ کی لاہور میں آمد

سلطان مسعود کی ہندوستان سے واپسی کے ایک سال بعد یعنی ۴۳۱ھ میں حضرت مخدوم علی ہجویریؒ ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں مقیم ہوئے جیسا کہ گذشتہ صفحات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے" حضرت علی ہجویریؒ کی تشریف آوری سے قبل پنجاب خصوصاً لاہور اسلام سے روشناس ہو چکا تھا پہلے امیر سبکتگین۔ پھر سلطان محمود غزنوی اور اس کے بعد سلطان مسعود غزنوی کے قدموں کو لاہور کی خاک بوسہ دے چکی تھی۔ ان فرماں رواؤں کے ساتھ عرب، ترک اور افغان سردار اور سپاہی بھی لاہور آئے اور ان میں سے

بعض نے یہیں رہائش اختیار کر لی۔ بادشاہوں، امراء اور سپاہیوں کے
علاوہ اولیا اللہ نے بھی لاہور کی فضا کو اپنے انفاسِ ضیا بار سے منور
کیا۔ حضرت شیخ اسماعیل لاہوری۔ حضرت شاہ حسین زنجانیؒ اور حضرت
سید یعقوب زنجانیؒ بھی حضرت مخدوم علی ہجویریؒ سے قبل لاہور میں
آ کر رشد و ہدایت کا فریضہ ادا کر چکے تھے۔

شیخ حسام الدینؒ لاہوری سے ملاقات

ان دو بزرگوں کے علاوہ جن کے ساتھ کچھ اور مسلمان بھی تھے ایک
بزرگ حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ کا نام بھی تاریخوں میں درج ہے۔
یہ بزرگ بھی حضرت مخدوم علی ہجویری کی تشریف آوری سے قبل اہلِ لاہور
کو اسلام کا پیغام دے چکے تھے۔ خود حضرت علی ہجویریؒ نے دیارِ ہند میں ان
سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور ان کے متعلق تعریفی کلمات
استعمال کئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"شیخ حسام الدینؒ ایک پاک طینت بزرگ تھے، انھوں نے
اٹھتر سال کی عمر میں انتقال کیا، میں ان کی بیماری کے آخری
دن ملاقات کے لئے گیا، اس وقت ان پر نزع کی کیفیت طاری ہو چکی
تھی، مجھے دیکھ کر کہا کہ اے میری جان! دعا کر کہ میرا انجام بخیر ہو"

جب وقت وہ آخری سانسیں لے رہے تھے تو میں اُن کے مُنہ کے قریب اپنا کان لے گیا، اس وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّی وَاَنَا عَبْدُکَ " اے میرے اللہ تو میرا رب ہے۔ اور میں تیرا بندہ ہوں۔"

میں نے اُن سے عرض کیا کہ اے شیخ میرے حق میں دعائے خیر فرمائیے انھوں نے فرمایا کہ ـ " اے علی! کسی کا دل نہ دکھایا کر اور کوشش کیا کر کوئی تجھ سے ناراض نہ ہو، جس قدر ممکن ہو، لوگوں کے ساتھ احسان سے پیش آ۔ مگر اس کے باوجود کسی بندہ کو اپنا دوست نہ سمجھ، اپنے علم کو ضائع نہ کر، بلکہ اس سے کام لے مال اور اولاد کو اپنے لئے فتنہ سمجھ کیونکہ اللہ تعالےٰ قرآنِ حکیم میں فرماتا ہے کہ انّما اموالکم واولادکم " تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں۔ " میری حالت سے عبرت حاصل کر اس وقت میری جان نکل رہی ہے، مگر نہ میرا بیٹا میری امداد کر سکتا ہے اور نہ کوئی رشتہ دار کام آسکتا ہے ـ جو کچھ میں نے اپنی زندگی میں کیا ہے وہی میرا توشہ ہے اور وہی میرے آگے آئے گا۔ "

ایک بار مجھ سے شیخ حسام الدّین لاہوریؒ نے کہا کہ ماں باپ

کا مرتبہ بہت بڑا ہے اگر کوئی شخص مصائب میں گرفتار ہو اور وہ اپنی ماں یا باپ کی قبر پر جا کر دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔" (کشف الاسرار)

ان تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ اسلام کے پہلے مبلغ نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے یہاں اسلام کا پیغام پہنچ چکا تھا، اور بہت سے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کہ امیر سبکتگین کی پنجاب میں آمد کے زمانے سے لے کر سلطان مسعود غزنوی کے اقتدار کے خاتمے تک یہ خطہ مختلف نشیب و فراز سے دوچار ہوا۔ کتنی بار یہاں مسلمان آتے اور ان کے حکمراں وقتی طور پر کامیابی حاصل کر کے چلے گئے۔ ان کے یہاں سے جانے کے بعد پھر اہلِ ہنود کا زور ہو گیا۔ اور بعض دفعہ تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہنود نے جوشِ انتقام سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ ان کی املاک لوٹ لیں اور مساجد کو منہدم کر دیا۔ ایک مورخ کے بیان کے مطابق سلطان مسعود غزنوی کے عہدِ اقتدار کے بعد راجہ جے پال کے بیٹے اننگ پال نے لاہور پر اس زور کا حملہ کیا کہ یہاں کے صرف ایک محلے میں دو ہزار مسلمانوں کی لاشیں دفن کی گئیں، اور مسلمانوں کا وجود عنقا ہو گیا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ حضرت علی ہجویریؒ کو اپنا تبلیغی مشن جاری کرنے

میں ہوش رُبا تکلیفات پیش آئی ہوں گی، جن سے اُن کے پیش روبزرگوں کو بہت کم دوچار ہونا پڑا، کیونکہ حضرت علی ہجویریؒ کے زمانے میں لاہور کی فضا مسلمانوں کے حق میں ناسازگار تھی۔ اور ہندو مسلمانوں کی صورت دیکھ کر ہی مشتعل ہوجاتے تھے۔ ان حالات میں حضرت علی ہجویریؒ کا لاہور تشریف لانا اور اسلام کی تبلیغ کرنا یقیناً جہاد بالسیف سے بڑا کارنامہ ہے، اور اس کے لئے انھیں بڑی صعوبتیں اٹھانی پڑی ہوں گی۔ اور اس مشن کو سخت ناخوشگوار حالات میں ازسرنو شروع کرنا پڑا ہوگا جو ان کے پیش رو بزرگوں نے جاری کیا تھا۔

آپ کی تبلیغی مساعی

اس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں کہ حضرت علیؒ ہجویری کی تبلیغی مساعی سے جو نتائج نکلے وہ آپ کے کسی پیش رو کی کوشش سے نہ نکل سکے چنانچہ مفتی غلام سرور کا بیان ہے کہ :۔

★ " انھوں (حضرت مخدوم علی ہجویریؒ) نے لاھور میں آکر ہنگامۂ فضیلت ومشیخت گرم کیا، دن کو طالب علموں کی تدریس اور رات کو طالبانِ حق کی تلقین ہوتی۔ ہزاروں جاہل ان کے ذریعہ سے عالم، ہزاروں کافر مسلمان، ہزاروں گمراہ رو بہ راہ،

ہزاروں دیوانے صاحبِ عقل و ہوش، ہزاروں ناقص کامل اور ہزاروں فاسق نیکوکار بن گئے، تمام زمانے نے ان کی غلامی کو اپنا فخر تصوّر کیا، اس وقت لاہور مرجع علماء و فضلا تھا، دُور دُور سے شیخ حضرت کی خدمت میں آکر بہرہ یاب ہوتے"۔

(حدیقۃ الاولیا صفحہ ۹۷)

آپ کی تبلیغ سے جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں شیخ ہندی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ منشی محمد الدین فوقؔ مرحوم ایڈیٹر اخبار کشمیری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :۔

★ " تاریخِ لاہور اور دیگر کتب میں جو لاہور کے حالات یا حضرت علی مخدوم ہجویری کے سوانحات کے متعلق ہیں لکھا ہے کہ حضرت کے دم قدم سے اہلِ پنجاب اور بالخصوص اہلِ لاہور کو بہت سے رُوحانی فیوض نصیب ہوئے اور سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو آپ کے اخلاقِ حسنہ اور کلام پُر تاثیر سے اسلام کی لازوال نعمت میسّر ہوئی۔ آپ کی زندگی اور آپ کے کلام نے وہ کام کیا، جو تیر و تفنگ اور تیغ و تبر سے بھی ناممکن تھا۔ دل جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ اور اس مظہر نورِ خدا، عارفوں کے پیرِ کامل اور کاملوں کے رہنما کی توجہ سے تاریکی سے روشنی

جہالت سے شائستگی، بے علمی سے علم اور کفر سے اسلام میں آتے تھے۔

اِن ہزار ہا بندگانِ خدا میں سب سے پہلے جو شخص مسلمان ہُوا وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ بلکہ سلطان مودود والیٔ کابل و غزنی کی طرف سے ولایت پنجاب کا نائب حاکم (گورنر) تھا تحقیقات چشتی اور دیگر کتب میں اس کا نام رلئے جو لکھا ہے۔ چونکہ یہ پہلا ہندو بلکہ ہندوستانی تھا جو حضرتؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہُوا تھا۔ اس لئے حضرتؒ نے اپنی دلی خواہش سے اس کا نام "شیخ ہندی" رکھا

(سوانح عمری حضرت داتا گنج بخشؒ ص ۴۸)

آپ کے مزار کے موجودہ سجادہ نشین اور مجاور اسی "شیخ ہندی" کی اولاد ہیں۔

تعمیرِ مسجد

لاہور تشریف لانے کے کچھ عرصے بعد آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور مزدوروں کے ساتھ خود بھی اس کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ اس مسجد کی تعمیر پر جو خرچ ہُوا وہ آپ نے اپنی جیب سے ادا کیا۔ اور پھر اسی مسجد کو اپنی تمام تبلیغی و تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس مسجد میں آپ باقاعدہ درس

دیتے تھے۔ اور یہیں مسلمان طالب علم آپ سے عربی اور قرآن حکیم کے اسباق لیتے تھے، اس مسجد کے ساتھ آپ نے ایک حجرہ تعمیر کرالیا تھا۔ تبلیغ وتدریس کے بعد آپ اسی حجرہ میں استراحت فرماتے تھے۔ یہ مسجد مرورِ ایّام سے بے نشان ہو گئی۔ البتہ اس کا نشان اس رنگ میں آج بھی موجود ہے کہ اسی زمین پر جہاں آپ نے مسجد تعمیر کی تھی۔ گلزار شاہ[1] نامی ایک شخص نے زرِ کثیر صرف کر کے قدیمی بنیادوں پر نئی مسجد تعمیر کرائی۔

علم وفضل

حضرت مخدوم سیّد علی ہجویریؒ پانچویں صدی ہجری کے وہ مردِ کامل تھے جنھیں عوام وخواص دونوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ نے بڑی پرکشش شخصیت پائی تھی، اور یہ کشش جن عناصر سے مل کر پیدا ہوئی تھی ان میں بڑا عنصر آپ کا علم وفضل تھا۔ آپ کو اپنے زمانے کے جیّد علماء کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا موقع ملا، اور آپ نے ان سے قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، فلسفہ اور تصوّف، غرض تمام مروجہ علوم کی تحصیل کی اور اپنی خداداد قابلیت وذہانت سے ان میں دستگاہ

---

[1] تحقیقاتِ چشتی صفحہ ۱۳۸

کا من حاصل کر لی، آپ کی تصنیفات کے مطالعے سے آپ کی وسعتِ معلومات
کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب "کشف المحجوب" معلومات کا
گنجینہ ہے جس میں علم و عرفان کے موتی بکھرے پڑے ہیں۔ اس کے مطالعے
سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علمِ تاریخ پر بھی بڑا عبور رکھتے تھے۔ اس کتاب
میں آپ نے عہدِ رسالت، خلفائے راشدین، فرماں روایانِ اسلام اور
حکمائے عرب و عجم کے جو واقعات و اقوال درج کیے ہیں ان کی صحت شک و
شبہ سے بالا ہے۔ ان واقعات و اقوال سے آپ نے جس رنگ میں استنباط
کیے ہیں اس سے آپ کی قوتِ استدلال کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی تصانیف
کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف مقلد نہیں تھے بلکہ ہر
معاملے میں اپنی آزادانہ رائے رکھتے تھے۔ اور آپ کی فکر و نظر کا راہوار ہموار
و ناہموار راستے سے سلامت روی کے ساتھ گزر جاتا تھا۔ علم تصوف کے جو
نکات آپ نے بیان کیے ہیں، وہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس
حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس علم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو آپ کی
نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ آپ روایات اور فنِ اسماء الرجال کے بھی عالم
تھے، سیرت نگاری میں بھی آپ کو حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا غرض اپنے
علم و فضل کے لحاظ سے آپ ان یادگارِ زمانہ لوگوں میں سے تھے جو کبھی کبھی
عرصۂ عالم میں آتے ہیں اور جب آتے ہیں تو ایک نیا عالم تخلیق کر جاتے ہیں۔

تصانیف

حضرت مخدوم علی ہجویریؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کا علم صرف ان کی ذات تک محدود رہتا ہے، نہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے علم کا دریا صرف مسندِ رُشد و ہدایت پر بیٹھ کر ہی بہا سکتے ہیں۔ بلکہ آپ ان لوگوں میں سے تھے جن کا زورِ قلم ان کے علم کو سینۂ قرطاس پر منتقل کر کے آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیتا ہے۔

پہلی تصنیف

حضرت علی ہجویریؒ کے تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ نوعمری ہی سے آپ کو تالیف و تصنیف کا شوق پیدا ہو گیا تھا، آپ خود اپنی کتاب کشف الاسرار میں لکھتے ہیں کہ وہاں (غزنی میں) شیخ بزرگ نامی ایک بزرگ تھے انھوں نے ایک روز مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اے علیؒ ایک ایسی کتاب لکھ کہ تیرا نام دنیا میں باقی رہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا شیخ! ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ صرف بارہ سال کا ہوں اور تالیف و تصنیف کے لئے جو علم درکار ہوتا ہے وہ بھی حاصل نہیں کیا ہے" پھر بھلا کتاب کیسے لکھوں، مگر جب انھوں نے بار بار کہا تو ان کا اصرار دیکھ کر میں گھر سے ایک کتاب لے آیا جو میں

نے انھیں دنوں لکھی تھی۔ اس کتاب کا مطالعہ کر کے شیخ بزرگ بہت خوش ہوئے
اور فرمایا کہ علم دین میں تیرا پایہ بہت اونچا ہوگا۔

یہ حضرت علی ہجویریؒ کی پہلی کتاب تھی، مگر افسوس کہ اس کا نام معلوم
نہ ہوسکا، نہ حضرت علی ہجویریؒ نے اپنی کسی تصنیف میں اس کا نام درج کیا ہے
اور نہ یہ کتاب رُوئے زمین پر کہیں موجود ہے۔

اسی طرح آپ کی ایک کتاب بحر القلوب ہے، کشف المحجوب میں اس
کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن کتاب ناپید ہے۔

منہاجُ الدّین

آپ کی تیسری تصنیف منہاجُ الدین ہے۔ یہ کتاب علم تصوّف سے
تعلق رکھتی تھی، اور غزنی کے دورانِ قیام میں لکھی گئی تھی، مگر افسوس کہ
آپ کے ہم جلیسوں میں سے ایک شخص نے اُسے اڑا لیا، اور اس پر سے آپ
کا نام کاٹ کر اپنا نام لکھ دیا، یہ شخص "منہاج الدین" کے مضامین لوگوں
کو سناتا اور اُن سے کہتا کہ یہ میری تصنیف ہے ناواقف لوگ اسے اسکی
کاوش سمجھ کر داد دیتے مگر آپ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اصل حقیقت سے
واقف تھے، وہ اس کے اس دعوے پر دل ہی دل میں ہنستے تھے، حضرت
علی ہجویریؒ کو اس کتاب کی چوری کا بڑا قلق ہوا اور آپ نے بڑے دکھے ہوئے

دل سے فرمایا کہ خدا اس کا نام روشن نہ کرے، چنانچہ یہی ہوا حضرت علی ہجویریؒ کا نام آسمانِ علم پر نجم درخشاں بن کر چمک رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک چمکتا رہے گا، مگر اس چور کا نام آج کوئی نہیں جانتا۔

البیان لاہل العیانؒ

یہ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ کی چوتھی کتاب ہے۔ اس کا ذکر آپ نے اپنی مشہور کتاب "کشف المحجوب" میں کیا ہے اور جس پیرائے میں کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں دنیا کی ناپائیداری پر روشنی ڈالی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ جن لوگوں کا دل پوری طرح اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ دنیا اور اس کی نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، اس دعوے کے ثبوت میں معراج کا وہ واقعہ پیش کیا گیا تھا، جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کون و مکان کی سیر کرائی گئی، اور آپ نے مشاہدۂ حق کے سوائے اور کسی جانب توجہ نہ فرمائی۔ افسوس کہ یہ کتاب روئے زمین سے نابید ہو گئی، گمان گذرتا ہے کہ شاید یہ وہی کتاب ہو جو آپ نے ابتدائے عمر میں لکھی تھی، اور جو شیخ بزرگ کو بھی دکھائی تھی۔ کیونکہ حضرت علی ہجویریؒ اسے اپنی ابتدائی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

اسرار الخرق والمؤنیات

یہ حضرت علی ہجویریؒ کی پانچویں کتاب ہے جس میں مُرشد اور مُرید کے تعلقات اور دونوں کے منصب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا ذکر بھی "کشف المحجوب" میں ہے۔ اس کتاب میں درویش کے ظاہر و باطن کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کو اور باطن کے ساتھ ظاہر کو پاک رکھو۔ اس میں آپ نے رُوحانیت کے مدارجِ ارتقا حاصل کرنے کے لئے تین بنیادی اصول پیش کئے ہیں۔ محبت، حفاظتِ نفس، اور پاکیزگی۔ کشف المحجوب میں اس کتاب کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ اس کا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ "مرد" میں ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب بھی ناپید ہے۔

کشف الاسرار

حضرت علی ہجویریؒ کی چھٹی کتاب "کشف الاسرار" ہے۔ یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور کشف المحجوب کی تالیف کے بعد لاہور میں لکھی گئی۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں آپ نے فقرا، صفاتِ حق تعالیٰ، ذکر و اشغال، نفس کشی، عبادت، ممانعتِ سماع اور صبر و شکر پر اختصار سے روشنی ڈالی

ہے۔ کتاب کے آغاز میں آپ نے لکھا ہے کہ :۔

★ " میں علی بن عثمان جلابی ہوں۔ میرے پاس طالبانِ حق کے لئے بہت سی مفید باتیں ہیں۔ جو شخص ان پر عمل کرے گا۔ وہ سرخیل مشائخ بن جاتے گا۔ میں نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" مختصر سی مدّت میں لکھ دی تھی۔ کچھ اور باتیں (جواب ذہن میں آتی ہیں) لکھتا ہوں اور نام اس کا کشف الاسرار تجویز کرتا ہوں"

●

اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشفُ الاسرار دراصل کشف المحجوب کا ضمیمہ ہے۔ آپ نے اس کتاب کے متعلق یہ بھی دعویٰ فرمایا ہے کہ میری یہ تالیف پڑھنے والے کو دوسری بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی یہ کتاب تعلق باللہ پیدا کرنے میں بے حد ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اور اس میں آپ نے جن مباحث کو چند صفحوں میں بیان کر دیا ہے، دوسروں کے لئے اسے کئی کئی جلدوں میں سمیٹنا بہت مشکل ہے۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتاب کا شگفتہ ترجمہ کیا جائے اور نہایت مفصّل شرح لکھی جائے۔ تاکہ تصوّف اور الٰہیات کے مبتدی بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

بالرعایت بحقوق اللہ

یہ حضرت علی ہجویریؒ کی ساتویں کتاب ہے اور مسئلہ توحید پر لکھی گئی ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ کے ان حقوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو بندوں پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ کتاب ان لوگوں کا دان شکن جواب ہے جو تثلیث کے قائل ہیں یا جنھوں نے بیسیوں فرضی خدا بنا رکھے ہیں۔ افسوس کہ یہ کتاب بھی عنقا ہو چکی ہے۔ صرف کتابوں میں اس کا نام ملتا ہے یا اس کے مضامین کا مجمل حال:

کشف المحجوب

یہ حضرت علی ہجویریؒ کی ساتویں تصنیف ہے اور مذہبی لٹریچر میں اس پائے کی بہت کم کتابیں ہوں گی۔ یہ کتاب ۴۴۸ھ کے بعد مضافات ملتان کی ایک مقام "بھنور" میں لکھی گئی۔ بہ ظاہر یہ علم تصوّف سے تعلق رکھتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور ایمانیات کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل اس میں نہ ہو۔ یہ کتاب آپ نے اپنے ایک رفیق ابوسعید ہجویریؒ کے بعض استفسارات کے جواب میں لکھی ہے۔ ابوسعید ہجویریؒ، تین افراد کے اس مختصر سے قافلے کے ایک فرد تھے جو حضرت علی ہجویریؒ کی معیّت میں غزنی سے

لاہور آیا تھا۔ ابوسعید ہجویریؒ نے آپ سے مندرجہ ذیل نو[9] استفسار کیے تھے۔

۱۔ تصوّف کیا ہے؟

۲۔ مقاماتِ تصوّف کے احوال۔

۳۔ تصوّف کے مختلف سلسلے اور ان کے معتقدات۔

۴۔ تصوّف کے اسرار و رموز۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کی محبّت کی کیفیت، اور وہ کس طرح دل میں گھر کرتی ہے؟

۶۔ عقل انسانی اللہ تعالیٰ کی حقیقت معلوم کرنے سے کیوں عاجز ہے؟

۷۔ ذاتِ خداوندی کی حقیقت معلوم کرنے سے نفسِ انسانی کو رغبت کیوں نہیں ہوتی؟

۸۔ اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کر کے رُوح سکون کیوں محسوس کرتی ہے۔

۹۔ اللہ تعالےٰ کے معاملات کی تشریح و توضیح۔

کشف المحجُوب کے مندرجات پر ایک سرسری نظر

کشف المحجُوب انھیں سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ یہ گیارہ ابواب

پر مشتمل ہے۔ کتاب لکھنے سے پہلے حضرت علی ہجویریؒ نے استخارہ کیا۔ اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اس کام میں آپ کی تائید و نصرت فرماتے۔

کتاب کی پہلی فصل ان اسباب کے بیان پر مشتمل ہے جن کے تحت آپ کو اس پر اپنا نام درج کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے آپ نے دو سبب بیان کیئے ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ جب علم تصوّف پر کوئی ایسی کتاب لکھی جاتی ہے جس میں مصنف نے جگہ جگہ اپنا نام درج نہ کیا ہو تو بعض غیر ذمہ دار لوگ اسے اپنے نام سے منسوب کر لیتے ہیں۔ اس طرح صاحبِ تصنیف کا یہ مقصد کہ اس کا نام ذکرِ خیر کے ساتھ دنیا میں زندہ رہے فوت ہو جاتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ دو ایک بار مجھے بھی اس حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک بار ایک شخص میرے اشعار کا دیوان مطالعے کے لیئے لے گیا۔ اور پھر وہ اپنے نام سے منسوب کر لیا، چونکہ اس کی کوئی نقل میرے پاس موجود نہ تھی اس لئے میں اس سے محروم ہو گیا، اسی طرح ایک شخص نے میری کتاب "منہاج الدین" پر سے بھی میرا نام حذف کر کے اپنا نام درج کر دیا، اور لوگوں میں اپنے آپ کو اس کا مصنف ظاہر کیا۔ کتاب پر نام درج کرنے کی دوسری وجہ آپ نے یہ بیان کی ہے کہ جب لوگ کسی مصنّف کی کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جو اپنے موضوع پر لاجواب ہوتی ہے تو ان کے دلوں میں صاحب تصنیف کی قدر و منزلت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اسے ایک محقق اور ماہر علم

وفن سمجھتے ہوئے اس کی کتاب کو پوری توجہ اور ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں، ان دونوں امور کو مدّنظر رکھ کر آپ نے عام دستور کے برعکس کشف المحجوب کے اکثر ابواب میں اس طرح اپنا نام درج کیا ہے کہ "میں جو علی بن عثمان جلابی ہوں بیان کرتا ہوں"۔ اس طریق کار سے آپ کی ایک مراد یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے آپ کو اپنی دعائے خیر میں یاد رکھیں۔

کتاب کی پانچویں فصل میں آپ نے "کشف المحجوب" نام رکھنے کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے اور اس سلسلے میں ایک بہت بلیغ نکتہ کی وضاحت فرمائی ہے جو تالیف وتصنیف سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کے لئے رہنمائی کا کام دے گا۔ آپ نے لکھا ہے کہ کتاب کا نام ایسا ہونا چاہئے جسے دیکھ کر انسان کا ذہن اُن معنی ومطالب کی طرف مبذول ہوجائے جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں اور علم وفن کا ذوق رکھنے والوں کی نظر جب کتاب کے سرنامے پر پڑے تو وہ پہلی نظر میں سمجھ لیں کہ اس کتاب میں صراطِ مستقیم، خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات اور بشریت کے چہرے سے نقاب اُٹھائے ہیں اور ان تمام امور کو بے حجاب کردیا ہے اس لئے اس کا نام "کشف المحجوب" تجویز کیا ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ موزوں نام اور کوئی نہ ہوسکتا تھا۔

کتاب کی باقی فصلیں عقائد، عبادات، اعمالِ صالحہ، تصوّف، فقر اور

مشائخِ عظام کے بیان پر مشتمل ہیں۔ صوفیا کے مختلف گروہوں اوران کے اکابر کے حالات ونظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صحابہ، اہلِ بیتِ رسولؐ تابعین اور کراماتِ اولیا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ معجزات وکرامات میں فرق، انبیاء اور اولیاء میں فرق، شریعت اور حقیقت میں فرق اور سماع کی حقیقت اس کتاب کے بڑے معرکتہ الآرا ابواب ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یہ تصوّف کی کتاب ہے اور یقیناً یہ علم تصوّف پر نہایت بیش قیمت تصنیف ہے، لیکن اس میں ہماری مذہبی اور روحانی زندگی کے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا انداز بیان بڑا دلچسپ ہے اور شاید ہی کوئی فصل ایسی ہو جس میں تاریخ کے واقعات یا سبق آموز حکایات درج نہ ہوں۔ اس طرح اس میں بڑی دلکشی پیدا ہوگئی ہے اور قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس کتاب میں ایک سو کے قریب صوفیا اور بزرگانِ دین کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اور قارئین کو ان کے نظریات وافکار سے روشناس کرایا گیا ہے

★ ذیل میں اس کتاب کے عنوانات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ تاکہ قارئین کو اندازہ ہوسکے کہ اس کتاب کے موضوعات کتنے وسیع ہیں:۔

کشف المحجوب کے عنوانات

(۱) استخارہ اور اس کے فوائد (۲) اخلاصِ عمل
(۳) نیت کا بیان (۴) اقسامِ حجاب
(۵) توفیقِ الٰہی (۶) عظمتِ علم
(۷) اقسامِ علم (۸) معرفتِ ذاتِ الٰہی
(۹) عقائدِ ملاحدہ (۱۰) حقیقتِ فقر
(۱۱) فقر اور غنا میں فرق (۱۲) فقیر کی تعریف
(۱۳) تصوّف کی تعریف (۱۴) بزرگانِ دین کے متصوفانہ عقائد
(۱۵) معاملاتِ تصوّف (۱۶) گودڑی پوشوں کا بیان
(۱۷) گودڑی پوشی کی شرائط (۱۸) فقیر کیلئے گودڑی ضروری نہیں
(۱۹) مشائخ کے نزدیک فقر و تصوّف میں فرق
(۲۰) طریقِ ملامت (۲۱) ملامت کے اسباب
(۲۲) ملامت کے فوائد (۲۳) وہ صحابہؓ جو صوفیا کے پیشوا تھے
(۲۴) ذکرِ اہلِ بیتِ رسولؐ (۲۵) ذکرِ اہلِ صفہ
(۲۶) تابعین کا بیان (۲۷) تبعِ تابعین کا بیان
(۲۸) متاخرین صوفیاء (۲۹) حقیقتِ رضا

(۳۰) حال اور مقام کا فرق (۳۱) فرقۂ قصاری
(۳۲) فرقۂ طیفوریہ (۳۳) سُکر اور صحو
(۳۴) فرقۂ جنیدیہ (۳۵) نوری فرقہ
(۳۶) بیانِ ایثار (۳۷) فرقۂ سہیلیہ
(۳۸) حقیقتِ نفس (۳۹) ارشاداتِ مشائخ در توضیحِ نفس
(۴۰) مجاہدۂ نفس (۴۱) ہوا و ہوس
(۴۲) فرقۂ حکیمیہ (۴۳) اسرارِ ولایت
(۴۴) تشریحِ ولایت (۴۵) ثبوتِ کرامت
(۴۶) کراماتِ اولیاء (۴۷) معجزہ اور کرامت میں فرق
(۴۸) انبیاء اور اولیاء فرشتوں پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔
(۴۹) فرقۂ خرازیہ
(۵۰) فنا اور بقا کا بیان (۵۱) فرقۂ خفیفیہ
(۵۲) غیبت اور حضور (۵۳) فرقۂ سیاریہ
(۵۴) تشریحِ جمع و تفرقہ (۵۵) فرقۂ حلولیہ
(۵۶) روح کا بیان (۵۷) معرفتِ حق
(۵۸) اقوالِ مشائخ دربارۂ معرفت (۵۹) بیانِ توحید
(۶۰) بیانِ توحید بزبانِ مشائخ (۶۱) ایمان کی تعریف

(٦٢) طہارتِ جسمانی
(٦٣) توبہ و استغفار
(٦٤) اقوالِ مشائخ دربارۂ توبہ
(٦٥) دربارۂ نماز
(٦٦) دربارۂ محبّت
(٦٧) بیانِ زکوٰۃ
(٦٨) بیانِ جود و سخا
(٦٩) دربارۂ روزہ
(٧٠) بھوک کی فضیلت
(٧١) دربارۂ حج
(٧٢) بیانِ کشف و مشاہدہ
(٧٣) بیانِ آداب
(٧٤) صحبتِ اہلِ تصوّف
(٧٥) آدابِ اقامت
(٧٦) آدابِ سفر
(٧٧) آدابِ خورونوش
(٧٨) آدابِ رفتار
(٧٩) سونے کے آداب
(٨٠) آدابِ خاموشی و گفتگو
(٨١) آدابِ سوال
(٨٢) بیانِ نکاح
(٨٣) اصطلاحاتِ تصوّف
(٨٤) محاضرہ و مکاشفہ
(٨٥) قبض و بسط
(٨٦) بیانِ انس وہیبت
(٨٧) دربارۂ قہر و لطف
(٨٨) بیان نفی و اثبات
(٨٩) تعریف مسامرہ و محادثہ
(٩٠) یقین کے تین درجات
(٩١) علم اور معرفت کا فرق
(٩٢) اصطلاحاتِ شریعت وحقیقت
(٩٣) دربارۂ سماع
(٩٤) قرآنِ حکیم کی اثر انگیزی
(٩٥) سماعتِ شعر

(۹۶) احکامِ سماع (۹۷) سماع کے بارے میں اقوالِ مشائخ
(۹۸) حقیقتِ سماع (۹۹) وجد و وجود
(۱۰۰) رقص کا عدم جواز (۱۰۱) حالتِ سماع میں لباس چاک کرنا
(۱۰۲) آدابِ سماع

کشف المحجوب پر ایک عمومی تبصرہ

کشف المحجوب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنے مصنف کی شخصیت اور اس کے حالاتِ زندگی سے روشناس کراتی ہے۔ بلکہ آپ کے حالات پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب کا مواد اسی کتاب سے حاصل کیا گیا ہے۔ اصل کتاب میں آپ نے اپنا نام۔ اپنے والد اور اپنے دادا کا نام، اپنا وطن، جائے پیدائش، اپنی بیعت، اپنے مرشد کا نام، ان کے حالات زندگی، اپنے اساتذہ کے نام اور ان کے حالات و معاملات، اپنی سیر و سیاحت اور ورودِ لاہور کی بابت اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ اس کی مدد سے آپ کے افکار و نظریات اور تعلیمات و ارشادات کی بھی بڑی صاف اور واضح تصویر نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے بڑے بسیط موضوعات کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ دو دو چار چار صفحات میں بیان

کر دیا ہے۔ اور یہ طرزِ تحریر اُن لوگوں کے لئے بڑا مفید ہے جو طویل بیانات پڑھنے سے گھبراتے اور جلد اکتا جاتے ہیں۔

کشف المحجوب کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ کتاب تصوف کے موضوع پر اس وقت لکھی گئی جب اس موضوع پر کوئی جامع اور مبسوط کتاب سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ مختصر سے چند رسالے تھے اور بس۔ ان حالات میں اس کے مصنف کا کام کتنا دشوار تھا؟ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو تالیف و تصنیف کے کوچے کے رہ نورد ہیں۔

کشف المحجوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان مفاسد کا بڑے مؤثر طریقے سے سدّباب کیا گیا ہے جو اُس زمانے میں زور پکڑ رہے تھے۔ دین میں جو بدعات داخل ہوگئی تھیں اور ظواہر پرستی نے اسلام پر جو دبیز پردے ڈال دیئے تھے حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب کے ذریعے سے اُن سب کا ازالہ فرمایا اور اسلام کو اس کی اصل شکل میں پیش کیا۔ اسلام کے حقیقی خد و خال ظاہر کرتے ہوئے آپ نے آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبویؐ، ارشاداتِ صحابہؓ اور بزرگانِ دین کے اقوال کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے اس طرح کتاب کے مندرجات میں بڑا وزن پیدا ہو گیا ہے اور آپ کے خیالات کی تردید کرنا بہت مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشف المحجوب کی تالیف اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اگر آپ کوئی اور کام نہ کرتے اور صرف یہی کتاب

لکھ دیتے تو بھی آپ کا شمار اسلام کے عظیم محسنین میں ہوتا۔ معلوم نہیں ہمارے مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے آپ کو امام کا درجہ کیوں نہیں دیا۔ اگر آپ کو اپنی صدی کا مجدّد کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ کی اس کتاب کشف المحجوب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، یہ ترجمہ مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ نے کیا ہے

حضرت علی ہجویریؒ کی شاعری

حضرت علی ہجویریؒ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ نہ صرف ذوق رکھتے تھے، بلکہ خود نہایت خوش گو شاعر تھے، آپ صاحب دیوان بھی تھے، مگر افسوس کہ ایک شخص آپ کا دیوان مطالعے کی غرض سے مانگ کر لے گیا اور ظالم نے اپنے نام سے منسوب کر لیا۔ اس طرح آپ کے قدردان اس نعمت عالی سے محروم رہ گئے، اپنے دیوان کی چوری کا یہ واقعہ آپ نے کشف المحجوب کی پہلی فصل میں بیان کیا ہے، اپنی دوسری کتاب "کشف الاسرار" میں آپ نے اپنے کچھ درج کئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شعر کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ شعر کہنے میں کبھی کاوش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جس وقت جذب و شوق کی کیفیت وارد ہوتی تھی، خود بخود شعر موزوں ہونے لگتے تھے، آپ نے اپنی شعر گوئی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

* "میں روزانہ اپنے محبوب کا دیدار کرنے جاتا ہوں۔ جب مجھے اس کا روئے زیبا نظر آتا ہے تو فوراً کسی کاوش کے بغیر میری زبان پر بے اختیار شعر جاری ہو جاتے ہیں۔ اس طرح میرا دیوان بن گیا۔"

آپؒ نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بلکہ ہمیشہ اپنے وجدانِ صحیحہ کو اپنا رہنما بنایا۔ آپ کی شاعری آورد اور تصنع سے پاک ہے۔ عشقِ الٰہی کے گرم جذبات ہیں جو آپ نے سادہ طریقے سے بیان کر دیئے ہیں، مگر اس سادگی میں بھی بلا کا حسن ہے۔ سوز و گداز اور جذبات کی شدت آپ کی شاعری کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ذیل میں آپ کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

اشتیاقت روز و شب دارم دلا — عشقِ تو دارم نہان و برملا
جان بخواہم داد اندر کوئے تو — گر مرا آزار آید یا بلا
سوز تو دارم بسانِ جان و دل — میدہم از عشقِ تو ہر سو صلا
یا خداوندا! رقیباں را بکش — مست درباوت بگرداں یا مرا
یارم من! داری شرابِ جام خوش — مہربانی کُن بمن غم مبتلا
دلبرا از تو ہمے خواہم لقا — کُن تو آرے و مکن ہرگز تولا

اے علیؔ! تو فرخی در شہر و کو
دہ ز عشقِ خویشتن ہر سو صلا

حضرت علی ہجویریؒ کی سیرت

حضرت علی ہجویریؒ اس گروہ کے سرخیل تھے جو اپنا سب کچھ رضائے الٰہی کے لئے قربان کردیتا ہے جس کا اوڑھنا بچھونا فقر کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا اور جب انسان کا دل دنیا کی حرص و ہوس سے پاک ہوجاتا ہے، تو وہ لوازم بھی خود بخود ختم ہوجاتے ہیں جن سے سیرت کے داغ دار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ تمام خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت اور آسائش کی آرزو ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی ہجویریؒ نے جن کا سرمایہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کے سوائے اور کچھ نہ تھا بڑی پاکیزہ زندگی گذاری انھوں نے کبھی کسی امیر یا بادشاہ کے دربار میں حاضری نہ دی۔ کبھی کسی رئیس یا بادشاہ کی خوشامد نہ کی بلکہ امراء کی مجالس سے ہمیشہ کنارہ کش رہے ہمیشہ رزق حلال کھایا۔ جو مل گیا اس پر قناعت کرلی۔ ان کی غذا نہایت قلیل اور معمولی تھی، بہت سادہ لباس استعمال کرتے تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ

☆ "مجھے جو مل جائے وہ پہن لیتا ہوں۔ اگر گودڑی میسر آجائے تو وہ پہن لیتا ہوں۔ پشم کا جامہ مل جائے تو وہ پہن لیتا ہوں۔ سفید کپڑا ملے تو اسے پہننے میں بھی تکلف نہیں۔"

کبھی کبھی سنتِ نبوی کی پیروی میں سخت کپڑے کی گودڑی پہنتے تھے، ہاتھ میں عصا اور چمڑے کا لوٹا دورانِ سفر میں ساتھ رہتا تھا۔ آپ نے اپنے اخراجات کا بار کبھی کسی مرید پر نہیں ڈالا۔ نہ کسی سے اپنی کسی پسندیدہ اور مرغوب چیز کی فرمائش کی۔

باوجودیکہ آپ نے زندگی کا بڑا حصّہ سیر و سیاحت میں گذارا مگر جمعہ کی نماز کبھی قضا نہ کی، جب جمعہ کا دن آتا تو آپ کسی نہ کسی قصبے میں چلے جاتے اور نماز باجماعت ادا کرتے۔ آپ نے اپنے اوقات کو اس طرح تقسیم کیا تھا کہ ایک لمحہ بھی بیکار نہیں جاتا تھا۔ دن کو طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ تیسرے پہر کو درسِ قرآن ہوتا تھا، رات کو طالبانِ حق اور زیرِ تربیت مرید فیض پاتے تھے۔ اس کے بعد جو وقت بچتا تھا۔ اس میں تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کرتے تھے، تعلیم و تصنیف کا کام کرتے تھے، اور رات کا زیادہ حصّہ عبادتِ الٰہی کی نذر کر دیتے تھے، زیادہ سونے کو آپ محبّتِ الٰہی کے لئے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔ بسیار خوری کی آپ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں جگہ بہ جگہ مذمت کی ہے۔

تحمل اور بردباری آپ کی سیرت کا نمایاں جوہر تھا۔ اسی کتاب میں کسی مقام پر ایک واقعہ درج کیا گیا ہے کہ ایک بار ظاہر پرست صوفیوں کے ایک گروہ نے آپ پر آوازے کسے، خربوزوں کے چھلکے پھینکے اور نہایت بدتہذیبی سے پیش آئے۔ مگر آپ کی جبین پر شکن تک نہ آئی۔ بلکہ آپ

فرماتے ہیں کہ مجھے ان کے اس طرزِ عمل پر یک گونہ خوشی ہو رہی تھی کہ میں انبیاء کی سنّت پر عمل کر رہا ہوں۔

تواضع اور فیاضی سے بھی آپ نے حصّہ وافر پایا تھا۔ مسافروں کی خدمت میں آپ قلبی راحت محسوس کرتے تھے، خود سفر میں ہوتے مگر جہاں قیام کرتے پہلے مسافروں کے قیام وطعام کا انتظام کرتے تھے، انھیں کھلاتے اور سونے کے لئے جگہ دیتے پھر خود کھاتے اور استراحت فرماتے، قیام عراق کے زمانے میں آپ نے سائلوں کو اس قدر دیا کہ مقروض ہو گئے اور جب قرض خواہوں نے تنگ کرنا شروع کیا تو وہاں کے ایک بزرگ نے آپ کو لکھا کہ اس شغل میں حق تعالےٰ سے دور نہ ہو جانا۔ اس واقعے کے بعد آپ نے سخاوت میں احتیاط کرنی شروع کر دی۔ مگر پھر بھی جب کسی نے سوال کیا اور آپ کے پاس کچھ ہوا تو اپنے نفس پر اُسے ترجیح دی۔

وفات

تقریباً ایک سو سال کی عمر پاکر روحانیت کا یہ آفتاب لاہور میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون ؕ

آپ کے سنہ وفات کے متعلق اختلاف ہے بعض مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے ۴۶۴ھ بعض نے ۴۶۵ھ اور بعض نے ۴۶۶ھ قرار دیا ہے۔

بیشتر مؤرخوں کا خیال ہے کہ آپ کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی مگر تحقیق کرنے سے یہ سنہ بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ زمانہ حال کے مؤرخ و محقق اور ہمارے بزرگ پروفیسر علم الدین صاحب سالک نے اپنے مختصر مگر جامع رسالہ "داتا گنج بخش" میں حضرت علی ہجویری کے سنہ وفات پر بڑی عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

★ "قدیم و جدید مؤرخ اور تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ آپ کا وصال لاہور میں ۴۶۵ھ میں ہوا۔ اگر اسے آپ کی وفات کا سال تسلیم کر لیا جائے تو آپ کی زندگی کی اکثر کڑیاں باہم مربوط نہیں رہتیں اور ان کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مؤرخین نے آپ کی مشہور و معروف کتاب "کشف المحجوب" کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر وہ اس کا مطالعہ کر لیتے تو یہ الجھاؤ پیدا نہ ہوتا۔

ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں کہ جب آپ کے مرشد اور پیر طریقت شیخ ابو الفضل محمد بن حسن ختلی کا وقت آخر آیا۔ "و آن روز کہ وی را وفات آمد... سر بر کنار من داشت ... وصیّت در از کرد و جان بداد" (کشف صفحہ ۲۰۹ طبع لینن گراڈ) ذہبی نے اس واقعہ کی تاریخ ۴۶۰ھ دی ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس واقعے کے معاً بعد آپ عازم لاہور ہوئے تو بھی آپ اگلے

سال یہ دور و دراز اور دشوار گذار سفر طے کر کے لاہور پہنچے ہوں گے۔
آپ کی مشہور تاریخ وفات یعنی ۴۶۵ھ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو آپ کے
قیام لاہور کی مدت تین چار سال رہ جاتی ہے۔ اس قلیل مدت میں یہ کیسے
ممکن ہو سکتا تھا کہ فریضہ تبلیغ اس حد تک بجا لائیں کہ بقول داراشکوہ اہل آں
دیار ہمہ مرید و معتقد او گشتند" (سفینۃ الاولیا ص۱۶۵) کہ اس کے بسنے والے
سب کے سب آپ کے مرید و معتقد ہو گئے۔ آپ نے مسجد بھی تعمیر کی۔ دن رات
فریضہ تبلیغ میں مصروف رہے جس حالت میں کہ ان کے مخاطب وہ سب
لوگ تھے جو سخت متعصب، تنگ دل اور تنگ نظر تھے اور اس کے علاوہ یہ
سارا علاقہ ابھی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کی تاخت و تاراج
کی جولانگاہ رہ چکا تھا۔ ان کی بت شکنی کی داستان ابھی تک ہر ایک کی زبان
پر تھی۔ ان حالات میں یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک درویش دنیوی ساز
و سامان کے بغیر اور ان لوگوں کی زبان سے ناواقف ہوتے ہوئے ان میں
ان میں اتنا اثر و رسوخ پیدا کر لے کہ وہ اس کی بات سن لیں اور اس سے
متاثر ہو کر آبائی مذہب ترک کر دیں۔ یہ انسانی طاقت اور قوت سے باہر ہے
اس کے لئے زیادہ وقت درکار ہے کیونکہ تین چار برس میں تو آپ انکی ذہنیت
اور زبان سے واقف ہوئے ہوں گے۔

کتاب مذکورہ (کشف المحجوب) میں ایسے بزرگوں کا ذکر ملتا ہے جن کی

خدمت میں مخدوم داتا گنج بخش رح باریاب ہو چکے تھے۔ مگر تصنیف کے وقت رحلت فرما چکے تھے، چنانچہ ان کے لئے آپ نے ماضی بعید کا صیغہ بھی استعمال کیا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتاب مذکورہ کی تصنیف کے وقت یہ بزرگ دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان میں امام ابوالقاسم قشیری (المتوفی ۴۶۵ھ) ابوالحسن سالبہ (المتوفی ۴۷۳ھ) ابوعلی فارمدی (۴۷۷ھ) شیخ عبداللہ القاری ہروی (۴۸۱ھ) خاص طور پر ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرتے ہیں، ان کے حالات اور سنینِ وفات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "کشف المحجوب" ۴۸۱ھ کے بعد مکمل ہوئی۔ آپ اس کے بعد بھی زندہ رہے۔ اس لئے آپ کی وفات کا زمانہ ۴۸۵ھ اور ۵۰۰ھ کے درمیان تعین کیا جا سکتا ہے۔ اور زیادہ اغلب یہی ہے کہ آپ ۵۰۰ھ کے آغاز میں فوت ہوئے ہوں۔" [صفحہ ۱۶ تا صفحہ ۱۸]

وفات کے بعد حضرت علی ہجویری رح کو آپ کی مسجد کے قریب ہی دفن کیا گیا، یہ جگہ لاہور کے مشہور محلہ بھاٹی دروازہ کے باہر جانب مغرب واقع ہے آپ کا مزار ابتدا ہی سے مرجع خلائق ہے۔ عوام و خواص دونوں نے آپ کے مزار پر حاضری دینا باعث سعادت سمجھا۔ برصغیر کی نامور رُوحانی شخصیتیں آپ کے مزار پر حصول برکات کے لئے آتی رہیں۔ ان بزرگوں میں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رح، حضرت

خواجہ باقی باللہؒ۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ حضرت شیخ محمدؒ اسماعیل المعروف وڈا میاںؒ، حضرت میاں میرؒ اور حضرت شاہ محمد غوث قادریؒ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں میں سے بعض نے آپ کے مزار پر چلہ کشی بھی کی۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لقب داتا گنج بخش کی بھی تصریح کر دی جائے۔

"گنج بخش" کا لقب

عوام الناس میں مشہور ہے بلکہ خواص بھی اسے ایک حقیقت کی طرح تسلیم کرتے ہیں کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ لاہور تشریف لائے تو آپ حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر بھی گئے۔ اور یہاں چالیس روز تک معتکف رہے۔ یہاں آپ پر بہت سے اسرار باطنی منکشف ہوئے اور جب یہاں سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے یہ شعر موزوں کیا ؎

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا

ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

اس کے بعد حضرت مخدوم علی ہجویریؒ داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہو گئے اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ جب تک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ مزار علی ہجویری پر معتکف نہ ہوئے تھے۔ اس وقت تک آپ حضرت مخدوم

علی ہجویریؒ ہی کے نام سے مشہور تھے۔ گنج بخش حضرت خواجہ معین الدینؒ کا دیا ہوا لقب ہے جس میں آپ کے عقیدت مندوں نے "داتا" کا اضافہ کرلیا۔ اور پھر آپ داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ لیکن یہ خیال حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ گنج بخش کا لقب حضرت معین الدین چشتی رح کا دیا ہوا ہے اور اس سے پہلے آپ کو اس لقب سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خود حضرت علی ہجویریؒ کی تحریر سے ملتا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :-

"اے علی! لوگ تجھے گنج بخش داتا کے لقب سے پکارتے ہیں۔ (حالانکہ) تیرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تو اس قسم کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ مت دے۔ یہ سخت تکبّر کی بات ہے۔ گنج بخش ہو یا رنج بخش یہ سب صفات ذاتِ حق کے لئے مخصوص ہیں۔" [کشف الاسرار ص۴۲]

حضرت علی ہجویریؒ کی تحریر کے اس اقتباس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں اوّل یہ کہ گنج بخش داتا کا لقب حضرتِ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چلہ کش ہونے سے بہت پہلے خود حضرت علی ہجویریؒ کی زندگی میں مشہور ہوچکا تھا۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ یہ لقب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا دیا ہوا ہے دوسرے یہ القاب حضرت علی ہجویریؒ کو سخت ناپسند تھا۔ اور آپ نے اس سے

بیزاری کا اظہار فرماتے ہوئے اسے کلمۂ شرک قرار دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس قسم کے الفاظ کو تکبر پر محمول فرمایا ہے۔ اور یہ پاکیزہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والا صفات کے علاوہ یہ الفاظ اور کسی کو زیب نہیں دیتے۔

اس سلسلے میں ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے اور وہ یہ کہ حضرت علی ہجویریؒ کی طرح حضرت خواجہ معینُ الدین چشتی رح بھی بہت بڑے مواحد اور تعلیماتِ اسلامی کے جید عالم تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس چیز کو حضرت علی ہجویریؒ شرک قرار دیں اسے حضرت معینُ الدین چشتیؒ عین اسلام سمجھیں۔ جن الفاظ کا سزاوار حضرت علی ہجویریؒ صرف ذاتِ حق کو قرار دیں۔ وہ الفاظ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ایک عاجز اور فانی انسان کی طرف منسوب کر دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب قصّے کہانیاں ہیں اور یہ شعر حضرت علی ہجویریؒ کے کسی غالی عقیدتمند نے موزوں کر کے حضرت خواجہ معینُ الدّین چشتی رح کی طرف منسوب کر دیا۔

حضرت علی ہجویریؒ کا مزار

بزرگانِ دین کے علاوہ سلاطینِ وقت نے بھی آپ کے مزارِ پُر انوار پہ حاضری دے کر اپنی قلبی عقیدت کا اظہار کیا، چنانچہ سلطان ابراہیم غزنوی

سلطان معزالدولہ غزنوی، سلطان خسرو شاہ غزنوی، سلطان خسرو ملک غزنوی، سلطان محمد غوری، سلطان قطب الدین ایبک، سلطان التمش سلطان غیاث الدین بلبن، سلاطین خاندانِ سادات، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور شہزادہ دارا شکوہ نے آپ کے مزار پر حصولِ برکات کے لیئے حاضری دی۔ سکھ حکمرانوں میں سے مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کا عقیدت مند تھا۔ کئی بار آپ کے مزار پر حاضر ہوا، اور اکثر نذرانہ کے طور پر گراں قدر رقوم بھیجتا رہتا تھا، اس کی رانیاں مہارانی چندر کور اور مہارانی موراں بھی آپ کی عقیدت گذار تھیں۔ ان کے بنوائے ہوئے دالان آج تک ان کی عقیدت مندی کا اظہار کر رہے ہیں،

★ حضرت علی ہجویریؒ کا مزار آپ کی وفات کے آٹھ سال بعد[1] سلطان ابراہیم غزنوی نے جو سلطان مسعود غزنوی کا جانشین تھا۔ اپنے صرفِ خاص سے تعمیر کروایا،

★ نہایت وسیع اور خوبصورت مزار تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے خوبصورت کمرے اور دالان بھی تھے۔ جن میں نہایت قیمتی پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ افسوس کہ یہ پتھر سکھ اپنے

---

[1] ہسٹری آف لاہور صفحہ ۱۷۹

عہدِ حکومت میں نکال کر لے گئے، اور مزار کی ملحقہ
عمارتوں کو بھی نقصان پہنچایا۔

شاہانِ وقت کے علاوہ امراء اور روساء اور لاہور کے گورنر بھی آپ سے
بڑی عقیدت رکھتے تھے، چنانچہ نواب معین الملک میر مومن خاں گورنر لاہور
نے تو وصیت کر دی تھی کہ میری قبر احاطۂ مزار میں بنائی جائے۔ چنانچہ اس
کی وصیت کے مطابق اسے آپ ہی کے مقبرے کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ نواب مرحوم
آپ کے مزار کے لئے ایک گراں قدر رقم دیا کرتا تھا، اور وقتاً فوقتاً مجاوروں
کو بھی نذر و نیاز سے نوازتا رہتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے بھی کچھ زمین اور دو
کنویں جن کے ساتھ بڑی وسیع زمین تھی حضرت علی ہجویری رح کے مزار کے
نام لکھ دی تھی، مزار کا جو حصہ بوسیدہ ہو گیا تھا اس کی مرمت بھی رنجیت سنگھ
نے کروائی تھی۔ اور نئی چھت بھی ڈلوائی تھی۔

★ "لاہور میں ایک شخص محمد خان ٹکسال والہ سکھوں
کے زمانہ میں تھا، جہاں اب میڈیکل کالج واقعہ ہے وہاں
ایک غیر آباد کنواں تھا، اس نے اسے آباد کر کے خانقاہ
کی نذر کر دیا تھا۔ انگریزوں کے ابتدائی عہد میں جب
چھاؤنی انارکلی تیار ہوئی تو وہ چاہ بھی ویران ہو گیا
اس کے ساتھ صرف ایک بیگھہ زمین شامل تھی۔ سرکار

انگریزی نے دریائے راوی پر متصل" رکھ والا گڈھر"
ایک بیگھ کے بجائے پانچ بیگھ زمین عطا کردی۔ نواب
غلام محبوب سبحانی رئیس اعظم لاہور اور ان کے
والد نواب شیخ امام الدین صوبہ کشمیر بھی اس خانقاہ
کی خدمت کیا کرتے تھے۔ آپ کے مزار کے چبوترے
کے گرد جو چاندی کا کٹہرہ ہے وہ بھی نواب غلام
محبوب سبحانی نے لگوایا تھا۔"

{ سوانح حیات داتا گنج بخش
صفحہ ۱۲۸۔ از فوق مرحوم }

افکار و نظریات

افکار و نظریات

حضرت مخدوم علی ہجویریؒ نے جس زمانے اور جس ماحول میں آنکھ کھولی، وہ تصوّف کا دَور تھا۔ ہر طرف اسی کی گرم بازاری تھی۔ کوئی شہر اور کسی شہر کا کوئی محلہ، کوئی خانقاہ، کوئی مسجد، کوئی درس گاہ اور کوئی مجلس ایسی نہ تھی جس میں تصوّف کے مسائل زیر بحث نہ آتے ہوں۔ وہ تمام لوگ جن کی علمی صلاحیتیں مفلوج ہو گئی تھیں اور جو کسی کام کے قابل نہ تھے صوفی بن بیٹھے تھے، ان ظاہر پرست، کم علم اور خام کار لوگوں کے ہاتھوں اسلام میں بہت سے عقائد باطلہ داخل ہو گئے تھے اور تصوّف کے متعلق بڑے مضحکہ خیز عقائد رواج پا گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ نے جو اپنے زمانے کے بہت بڑے صوفی بلکہ تصوّف کے امام تھے، اس مسئلے کو خاص طور سے موضوعِ گفتگو بنایا اور اپنی علمی و روحانی بصیرت سے کام لے کر وہ تمام

پردے ایک ایک کر کے چاک کر دیئے جنھوں نے تصوّف کے چہرے کو چھپا لیا تھا ذیل میں قدرے تفصیل کے ساتھ تصوّف کے متعلق آپ کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ تصوّف جسے عجیب گورکھ دھندا بنا دیا گیا ہے، کیسا سیدھا، صاف اور روشن مسلک ہے اور اس کا دائرہ ہماری عملی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے۔

صوفی کی تعریف

لفظ صوفی کی تعریف کرتے ہوئے لوگوں نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ ایک جماعت کے خیال میں صوف کا لباس پہننے والے کو صوفی کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ لفظ صوفی صفا سے مشتق ہے۔ عصر حاضر میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا ہے۔ جو سرے سے تصوّف کا قائل ہی نہیں ہے اور وہ اسے ایک بے اصل چیز قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ صوفی صفا ہی سے مشتق ہے اور صفا کے معنی ہیں روشن اور ظاہر۔ یعنی صوفی کی تعریف یہ ہے کہ وہ شخص جس کا دل ہر قسم کی کدورت سے پاک ہو حقیقی صوفی وہی ہوگا جو تاریکی سے دامن بچا کر نورِ حق کو اپنا مرکزِ نگاہ بنا لے گا، زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے اندر اخلاقِ فاضلہ پیدا کر لئے۔ اپنے معاملات کو درست کر لیا۔ اور اپنے باطن کو ہر قسم کے شرک اور ہر طرح

کے کفر سے نجات دیدی انھیں صوفی کے لقب سے پکارا گیا۔

معاملاتِ تصوّف

بعض علماء، رسم پرست صوفیاء کی حالت اور رقص و سرود سے اُن کے غیر معمولی شغف کو دیکھ کر تصوّف سے بدگمان ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ خام کار اور جاہل صوفی سلاطینِ وقت کی درباداری کرتے ہیں اور درہم و دینار کے لیے ان کی جھوٹی خوشامد کرنا ان کا شعار بن چکا ہے تو انھوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ تصوّف لہو و لعب اور جاہ طلبی کا ذریعہ ہے۔ بعض نے بھی نہیں رسم پرست اور دنیا دار صوفیوں کا طریقِ کار دیکھ کر ہمارے زمانے کے علماء نے یہ نتیجہ نکالا کہ ازمنۂ گذشتہ کے صوفی بھی اسی قماش کے لوگ ہوں گے۔ مگر یہ رائے قائم کرنے میں انھوں نے دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ کیا خود علماء کے گروہ میں گمراہ، رسم پرست اور بدعمل لوگ موجود نہیں ہیں؟ اس قسم کے علماء ہر دور میں رہے ہیں۔ بس اسی طرح صوفیا کے طبقے میں بھی بعض رسم پرست اور گمراہ لوگ پیدا ہوئے اور آج بھی ہیں۔ مگر اس سے نفسِ تصوّف پر تو کوئی الزام نہیں آتا۔ اس قسم کے غلط خیالات پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ تصوف کے حقیقی معنٰی سے ناواقف ہیں۔ تصوف نام ہے پسندیدہ اخلاق کا۔ تصوّف کے یہ معنی حضرت ابو علی قزوینیؒ نے

بیان کئے ہیں۔ حضرت ابوالحسن نوریؒ تصوف کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تصوّف نام ہے دل و دماغ اور فکر و عمل کو باطل سے مکمل طور پر آزاد کر لینے کا، جادۂ عمل پر ہمت کے ساتھ گامزن رہنا۔ رسوم و رواج اور تکلفات دُنیا سے پرہیز کرنا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے غربا و مساکین کی امداد کرنا تصوّف کا لازمہ ہے۔ حضرت مرتعشؒ کا ارشاد ہے کہ تصوّف نام ہے حسنِ اخلاق کا۔ یہ کلّی طور پر تلاشِ حق اور حق اندیشی سے عبارت ہے اسلئے باطل اور لہو و لعب کا اس میں دخل نہ ہونے دو حضرت ابوحفص حدّاد نیشاپوری تصوّف کے متعلق فرماتے ہیں کہ

”تصوّف سارا کا سارا ادب ہے، یعنی جملہ اوقات میں ادب ہے اور جملہ مقامات اور حالات میں ادب ہے۔ جو شخص تصوّف کے اِن جملہ آداب کی پابندی کرتا ہے اور صرف قول سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے ان آداب کی پیروی کرتا ہے وہ حق تعالےٰ کے محبوب بندوں میں شامل ہو جاتا ہے اور جو شخص ان آداب کی طرف سے لاپرواہی کا اظہار کرتا ہے وہ بارگاہِ خداوندی میں بار نہیں پا سکتا۔“

پس میرے نزدیک تصوّف سراسر اخلاق ہے اور تصوّف کا مسلک اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنی سیرت اور اپنے معاملات کو درست کیا جائے عجز و انکساری اور تحمل و بردباری کو شعار بنایا جائے۔ اور شریعت کی اتباع

کی جائے۔ جس شخص میں یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں تو سمجھو کہ اُس نے مسلکِ تصوّف کی صحیح طور پر پیروی کی اور وہی یقیناً صوفی ہے۔

تصوّف اور گودڑی پوشی

صوفیا کا ایک گروہ گودڑی پہننے کو تصوّف کا لازمہ قرار دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گودڑی صوفیوں کی علامت ہے اور ہمارے اکابر نے بھی گودڑی پہنی ہے۔ مگر یہ تصوّف کا لازمہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ اصل چیز تقویٰ اور باطنی صفائی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے اور علامت تو غیر ہے۔ مجرد گودڑی پہن لینا ایک عبث فعل ہے۔ صرف گودڑی تو چوپایوں کا لباس ہے۔ اس لئے کوئی خاص فقیرانہ لباس پہن لینا اور اعمال اس کے برعکس انجام دینا حیلہ سازی کے سوائے اور کچھ نہیں۔

ایک بار ایک شیخ کسی دوسرے شیخ سے ملنے آیا۔ وہ ایک گودڑی پہنے ہوئے تھا۔ جس پر چوڑی چوڑی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ اس شیخ نے گودڑی پوش شیخ کو اپنی مجلس سے نکال دیا۔ کیونکہ اس کا یہ پُرتکلّف لباس شیخ کی طبیعت پر گراں گزرا۔ پس یاد رکھو کہ تصوّف کا دارومدار کسی مخصوص لباس پر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار عمل پر ہے۔ جب کسی شخص کو آدابِ طریقت کا ادراک ہو جاتا ہے اور اس کا باطن روشن ہو جاتا ہے تو اس

کا امیرانہ لباس بھی شانِ فقیرانہ رکھتا ہے۔ لیکن جب ایک شخص طریقت و حقیقت ہی سے ناآشنا ہے تو اس کی گودڑی اس کی روحانیت میں کیا اضافہ کرے گی۔ ہمارے بہت سے بزرگ گذرے ہیں جن کا کوئی مخصوص لباس نہ تھا۔ کبھی گودڑی پہن لیتے تھے۔ کبھی ریشم کا لباس زیب تن کر لیتے تھے۔ کبھی قبا اور کبھی سفید جامہ ہی زیب تن کر لیا کرتے تھے۔ غرض جو مل جاتا تھا پہن لیتے تھے، میں علی بن عثمان جلابی (ہجویری) بھی اسی خیال کا ہوں اور انھیں بزرگوں کا طریقہ مجھے پسند ہے۔ میں لباس کو کچھ اہمیت نہیں دیتا۔

مسئلہ سماع

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اچھی آواز اور نغمہ مجھے ناپسند ہے تو اس کا یہ کہنا غلط ہوگا۔ ایسا شخص یا تو جھوٹا ہے یا منافق۔ یا پھر وہ حسِ لطیف ہی سے محروم ہے۔ پس ذوقِ سماعت فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ لیکن جس طرح ہر شخص کی طبیعت دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح سماع کے احکام بھی ہر شخص کی طبیعت کے مطابق جداگانہ ہیں۔ اگر کوئی سب پر ایک ہی حکم لگائے تو وہ احمق ہے۔

سماع کا ذوق رکھنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی نظر معانی کی طرف ہوتی ہے۔ وہ الفاظ اور آواز کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے

اور دوسرے وہ جو صرف نغمہ اور آواز پہ فریفتہ ہوتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ نغمہ و آواز کا معاملہ دو اسباب سے خالی نہیں ہے۔ یعنی اس میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہے کہ دلکش آواز سننے سے اہلِ حق کی طبیعت میں گداز پیدا ہوتا ہے اور اچھے جذبات جوش مارنے لگتے ہیں نقصان یہ ہے کہ جب یہی دلکش آواز اہلِ باطل یعنی فاسق و فاجر لوگ سنتے ہیں تو ان میں خیالاتِ فاسدہ جوش مارنے لگتے ہیں۔ پس اچھی آواز سننے سے اگر طبیعت میں حق ہوگا تو وہ زور پکڑے گا۔ اور اگر کسی شخص کی طبیعت میں فساد ہوگا تو نغمہ سن کر اُس کا فساد اور بڑھے گا۔ پس سماع کو بحیثیت مجموعی ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اور نہ اسے لازمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ بعض کم فہم صوفیاء نے اہلِ حق درویشوں کو نغمہ سنتے دیکھا تو اس کے آداب اور شرائط پر نگاہ کئے بغیر یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ سماع ہر حال میں جائز ہے اور بعض لوگوں نے ان صوفیاء کے حال پر نگاہ کی جو نغمہ نہیں سنتے تو کہہ دیا کہ سماع ناجائز ہے، حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں، سماع کے کچھ آداب اور شرائط ہیں۔ ان آداب و شرائط کے ساتھ یہ حلال اور جائز ہے۔

شرائطِ سماع

میں جو علی بن عثمان ہجویری ہوں کہتا ہوں کہ اس معاملے میں میرا

اصول یہ ہے کہ سماع کی محبس میں تصوّف کے مبتدیوں کو شریک نہ ہونا چاہیئے کیونکہ مبتدی لوگوں میں ضبطِ نفس کا جوہر نہیں ہوتا اور ہیجان پیدا کرنے والے امور انھیں فتنہ میں مبتلا کر دیتے ہیں، مجلسِ سماع میں نوعمر اور خوبصورت لڑکوں کو بھی شریک نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس طرح خیالات میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے۔ کسی ایسی جگہ پر بھی مجلسِ سماع منعقد کرنا درست نہیں جہاں چھتوں پر سے عورتیں درویشوں اور گانے والوں کو دیکھ رہی ہوں۔ اس میں عورتوں اور سماع میں شریک ہونے والوں دونوں کیلئے خسارہ ہے۔ سماع میں صرف وہی لوگ شریک ہوں جو تمام امورِ شریعت کی پابندی کرتے ہیں اور جن کے دل ہوا و ہوس سے پاک ہیں۔

سماع کو طبیعت کا لازمی جزو نہیں بنانا چاہیئے۔ جہاں تک ہو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ سوائے اس کے کہ اس کی خواہش شدت سے پیدا ہو، اور آدمی اس پر قابو نہ پا سکے، پھر سماع کی مجلس میں صرف پاکیزہ اور عارفانہ کلام سنا جائے، جو لوگ اشعار میں معشوقِ مجازی کے حسن و جمال اور خد و خال کا ذکر سن کر جھومتے ہیں ان کا سماع ناجائز ہے، اور یہ تصوف کے قطعاً خلاف ہے۔

سماع میں مزامیر (آواز پیدا کرنے والے باجے مثلاً ستار وغیرہ) سننا شرع کی رُو سے ناجائز ہے اور جو اسے جائز کہتا اور اس کے لئے جواز

ڈھونڈتا ہے وہ کافر ہے۔ اسی طرح میں نے دیکھا ہے کہ مجلسِ سماع میں بعض لوگ اپنی مستی کا اظہار کرنے کے لئے کپڑے پھاڑنے لگتے ہیں۔ میں نے علمائے حق سے سُنا ہے کہ ثابت لباس کو چاک کرنا سراسر ناجائز ہے اور یہ اسراف کے حکم میں آتا ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی شخص شدّتِ جذبات سے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے اور ظاہر ہے کہ بے ہوش انسان پر کسی قسم کا حکم نہیں لگ سکتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان تمام چیزوں میں جن کے سُننے سے دل میں فرحت اور دماغ میں قوّت پیدا ہوتی ہے اور یقین وایمان میں پختگی آتی ہے۔ سب سے ارفع و اعلیٰ چیز کلامِ الٰہی ہے۔ اس کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ تمام چیزیں جو سماعت کے ذریعہ سے ہمارے دل و دماغ تک پہنچتی ہیں، خواہ نثر ہو یا نظم، انسانوں کی تخلیق کردہ ہیں لیکن قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ ہے جو ہر خطا اور غلطی سے پاک ہے پس اسے سُننا چاہیئے کہ اس کے سُننے سے قلب کو ابدی زندگی ملتی ہے۔

وجد و رقص

اچھی آواز یا اچھا شعر سن کر طبیعت کا متاثر ہونا فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ یہ تاثر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک کے تحت انسان غمگین ہو جاتا ہے اور دوسرے کے تحت اسے انبساط و مسرّت محسوس ہوتی ہے۔ اس مسرّت کی انتہائی

کیفیت میں اس پر وجد طاری ہو جاتا ہے، بعض دفعہ وہ جھومنے لگتا ہے اور بعض دفعہ اس میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے جس سے وہ بے قرار ہو جاتا ہے۔ یہ تو سماع کا قدرتی اثر ہے مگر جو لوگ اپنے آپ کو اہلِ تصوّف میں شامل کرنے کے لئے مصنوعی طور پر اس قسم کی کیفیات وارد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ فعل محض رسم پرستی اور نقالی پر مبنی ہے اور یہ ایک ناپسندیدہ اور ناجائز فعل ہے۔

اسی طرح بعض لوگ سماع کے عالم میں رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن شریعت اور طریقت دونوں میں سے کسی میں بھی رقص کرنے کا کوئی جواز نہیں ملتا، مشائخ نے متفقہ طور پر رقص کو شیطان کا حربہ قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ فسق و فجور اور بدکاری کا ایک ذریعہ ہے اور کچھ نہیں رقص شہوانی جذبات کو پیدا کرتا ہے اور زنا کی تحریک کرتا ہے پس وہ تمام لوگ جو اس شیطانی فعل کا ارتکاب کرتے ہیں ابلیس کی نسل سے ہیں۔

میری نظر سے جہلا اور فاسق لوگوں کا ایک گروہ گذرا ہے، وہ لوگ لوگ کہتے تھے کہ رقص تو تصوّف کا مسلک ہے۔ لیکن درحقیقت نفس کے ان جاہل غلاموں نے وجد اور رقص کو ہم معنی کر لیا۔ اور اس طرح عوام کو گمراہی میں مبتلا کر کے تصوّف کو بدنام کیا ہے، جاننا چاہئے کہ وجد اور رقص ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں ہیں، کیونکہ وجد میں وہ

حرکات وسکنات کہاں پیدا ہوتے ہیں جو رقص میں ظاہر ہوتے ہیں ——
وجد تو ایک ربّانی کیفیت ہے اور رقص سراسر فعل شیطانی ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اہلِ طریقت اور اہلِ تصوّف کے کسی قول سے رقص کی سند نہیں ملتی، اور سب کا اتفاق ہے کہ رقص قطعاً ناجائز ہے۔ اور اسمیں مبتلا ہونے والے لوگوں کو شریعت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔

تصوّف کے متعلق اقوال مشائخ

تصوّف اور اس کی حقیقت کے متعلق مختلف مشائخ نے نہایت بیش قیمت نکات بیان کئے ہیں۔ چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کا ارشاد ہے کہ جس وقت ایک صوفی کلام کرتا ہے تو اس کے الفاظ سے حقائق کے سوتے پھوٹ رہے ہوتے ہیں اور جب وہ خاموش ہوتا ہے تو اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اس وقت دُنیا سے اپنے سارے روابط توڑ کر ذاتِ الٰہی کی معرفت میں گم ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ کلام کرتا ہے تو وہی بات کہتا ہے جس پر خود عمل کرتا ہے، اور جب خاموش ہوتا ہے تو یہ خاموشی اس کے باطن کا اظہار ہوتی ہے۔ اور اس وقت اس کا باطن سوائے اللہ کے تعلق کے باقی ہر تعلق توڑ چکا ہوتا ہے۔
حضرت جنیدؒ کا ارشاد ہے کہ صوفی وہ ہے کہ بشریت کی تاریکی اور فسق

وفجور کی آلودگیوں سے جس کی روح پاک ہوگئی۔ اور وہ ان تمام آفتوں سے نجات پاگیا جو خواہشاتِ نفسانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ علمائے امّت کی صفِ اوّل میں جگہ پاتے ہیں۔ اور مشاہدہٴ ذاتِ حق کی نعمت سے ہر وقت متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت ابوالحسنؒ فرماتے ہیں کہ صوفی کی تعریف یہ ہے کہ وہ شخص جو اس کائنات کے جملہ عناصر کے فانی ہونے پر ایمان رکھتا ہو، نہ دنیا کی کسی چیز کو مستقل طور پر اپنی ملکیت سمجھتا ہو اور نہ اپنے آپ کو کسی غیر اللہ کی ملکیت میں دنیا گوارا کرتا ہو حقیقی معنی میں صوفی ہے!

ابن الجلالی دمشقیؒ کا ارشاد ہے کہ "تصوّف نام ہے ایک حقیقت کا یہ رسم نہیں ہے۔" اس لئے عارف باللہ ہی تصوّف کا صحیح فہم حاصل کر کے اس کی صفاتِ صحیحہ کو پا سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ رسم پرست ہیں وہ اس کی معنویت اور صحیح کیفیت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ "حقیقی صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں اللہ تعالےٰ کے سوائے ۔۔۔۔ اور کچھ نہ دیکھے، یعنی اسے ہر طرف اور ہر جگہ صرف اللہ تعالیٰ ہی نظر آتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوائے ہر چیز اس کی نگاہوں میں بے وجود ہو جاتی ہے، دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب صوفی موجوداتِ عالم کو دیکھتا ہے تو بھی اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ

اس ذریعہ سے وہ اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات کی معرفت حاصل کرے۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ تصوّف کی آٹھ صفات ہیں۔ سخاوت، رضائے الہٰی، صبر، اشارہ، مسکین، موٹا لباس، سیاحت، فقر۔ اب ان صفات کی مثالیں (انبیاءؑ کی زندگی میں دیکھو)۔ سخاوت کو انتہا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہنچا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے بیٹے تک کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔ رضا کی مثال چاہو تو حضرت اسمٰعیلؑ کا واقعہ دیکھو کہ انھوں نے اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا، صبر کی مثال دیکھنی ہو تو حضرت ایوبؑ کے واقعہ پر غور کرو کہ سارے جسم میں کیڑے پڑ گئے مگر حرفِ شکوہ زبان پر نہ آیا، اور آخر تک جادۂ صبر و رضا پر گامزن رہے۔ اشارہ کی مثال دیکھنی ہو تو حضرت ذکریاؑ کے واقعہ پر غور کرو کہ اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں تین روز مسلسل لوگوں سے اشارہ سے بات کرتے رہے اور زبان نہ کھولی، غربت کی مثال حضرت یحییٰؑ کی زندگی میں دیکھو کہ اپنوں میں رہے مگر ان سے بیگانگی اور بے تعلّقی رکھی۔ اُن کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آیا۔ اور انھیں اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل ہوا۔ موٹے لباس کی مثال حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں دیکھو کہ ان کے سارے کپڑے اسی لباس کے ہوتے تھے۔ سیاحت کی مثال حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں دیکھو کہ تبلیغ و ارشاد کے لئے ساری عمر سیر و سفر میں گذار دی۔ فقر کی

مثال آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ میں دیکھو کہ زمین و آسمان کے خزانوں کے مالک ہوتے ہوئے مسکینی کو قبول فرمایا۔

حضرت محمد بن احمد بقریؒ کا ارشاد ہے کہ

• "تصوّف یہ ہے کہ اس مسلک کو اختیار کرنے والا اپنے تمام اعتقادات، اعمال اور ظاہری و باطنی کیفیات کو احکام خداوندی کے تابع رکھے، اور ہر حالت میں ذاتِ حق کے دامن سے وابستہ رہے۔"

ابن احمد بقریؒ نے یہ اس لئے کہا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے دل و دماغ اور اعتقادات و اعمال کو رضائے الٰہی کے تابع کر دے گا تو اس کی طبیعت میں ایسی باطنی استقامت پیدا ہو جائے گی جو ظاہری تبدیلیوں سے اثر پذیر نہیں ہو سکے گی۔ اور کوئی امر اسے راہ راست پر چلنے سے نہیں روک سکتا۔

صوفیاء کے فرقے

صوفیاء کے بارہ فرقے ہیں۔ ان میں سے ۲ فرقے مردود و نامعتبر ہیں اور باقی ۱۰ معقول و قابلِ اعتنا ہیں۔ ان دس فرقوں میں طریقت اور معرفت کے اصولوں میں مکمل اتفاق ہے۔ البتہ ان کی ریاضت اور مجاہدات کے طریقوں میں اختلاف ہے۔ اب میں اختصار کے ساتھ ان کے اقوال درج کر کے ان

کے اختلافات پر روشنی ڈالوں گا اور ہر فرقے کے مسلک قدرے تفصیل سے بیان کروں گا۔

فرقہ محاسبیہ

یہ فرقہ ابو عبداللہ حارث بن اسد محاسبیؒ کا پیرو ہے۔ ابو عبداللہ محاسبیؒ اپنے زمانے کے بہت بڑے عارف و عالم اور فروع و اصول کے امام تھے آپ نے توحید اور تصوّف کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں بڑی احتیاط برتی ہے اور صحت کا خیال رکھا ہے۔ آپ کی تعلیم کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ آپ نے "رضا" کو تصوّف میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ اسے احوال کے زمرہ میں رکھا ہے لیکن خراسان اور عراق کے صوفیاء اور علماء نے آپ کے اس خیال پر سخت تنقید کی اور کہا کہ رضا تصوّف ہی سے تعلق رکھتی ہے بلکہ یہ تصوّف کا سب سے اونچا مقام ہے۔

فرقہ قصاری

یہ فرقہ ابو صالح بن حمدون بن احمد بن عمارۃ القصاریؒ سے وابستہ ہے۔ ابو صالح القصاری اپنے زمانے کے بزرگ تھے اور طریقہ ملامت پر عامل تھے۔ بلکہ مذہب ملامت کو آپ ہی نے جاری کیا ہے۔ مذہب ملامت

کی اصل یہ ہے کہ انسان کو وہ طریق کار اختیار کرنا چاہیئے جس سے اس کا غرور ٹوٹ جائے۔ غرور دو اسباب سے پیدا ہوتا ہے ایک اس طرح کہ جب کوئی شخص لوگوں میں معزز ہو جاتا ہے تو لوگوں کی تعریف و توصیف اس میں غرور کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ غرور کا دوسرا سبب یہ ہے کہ جب کوئی شخص بڑا کارنامہ انجام دیتا ہے یا اسے اپنا کوئی کام پسند آتا ہے تو اس میں غرور و تفاخر کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پس یہ فرقہ اس غرور و پندار کو توڑنے کے لئے وہ طریقے اختیار کرتا ہے جس سے لوگ اس پر ہنسیں اور اس کی تحقیر کریں، اپنی تحقیر ہوتے دیکھ کر انسان میں انکساری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس طرح وہ خدا کے قریب ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کو عاجزی اور انکساری بہت پسند ہے۔ فرقہ قصاری اپنے طریق ملامت کے لئے امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے اس واقعے سے سند لیتا ہے کہ ایک روز آپ اپنے زمانہ خلافت میں خرموں کے باغ سے روانہ ہوئے اور باوجودیکہ آپ کے ساتھ بہت سے غلام چل رہے تھے۔ مگر لکڑیوں کا ایک گٹھا آپ نے اپنے سر پر رکھا ہوا تھا، راستے میں لوگوں نے پوچھا کہ امیر المومنین! لکڑیوں کا یہ گٹھا غلام بھی تو اٹھا سکتے ہیں، پھر آپ نے خود کیوں اٹھا رکھا ہے۔" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ یقیناً غلام یہ کام کر سکتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ امیر المومنین ہونے کا فخر میرے نفس کو کسی ایسے کام سے نہ روکے جسے عوام میں حقیر سمجھا جاتا ہے اس

لئے میں لکڑیوں کا یہ گٹھا خود اٹھائے لئے جا رہا ہوں!"

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ طریقِ ملامت کے باب میں کوئی ایسا اقدام نہ ہو جس سے ارکانِ اسلام کی توہین ہوتی ہو یا کسی رُکنِ اسلام کی نفی کا جواز پیدا ہوتا ہو، بعض درویش نماز ترک کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ لوگ ہم پر ملامت کریں اور اس طرح ہم میں انکساری کا جذبہ پیدا ہو۔ سو جاننا چاہئے کہ یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ اسی طرح جان بوجھ کر محض رسم کے طور پر ملامت کے اسباب پیدا کرنا بھی درست نہیں ہے

فرقۂ طیفوریہ

یہ فرقہ ابو یزید طیفور بن عیسٰی بن سروشان بسطامیؒ کا پیرو ہے یہ جماعتِ صوفیا میں بڑے پلّے کے بزرگ گذرے ہیں اور سکر کے طریقے پر عامل تھے۔ سُکر کا مطلب ہے اللہ تعالےٰ کی محبت میں دنیا و ما فیہا سے بے خبر اور اس حال میں مست رہنا۔ اسی حالت میں درویش لوگوں سے اختلاط نہیں رکھتا۔ سوائے اس کے کہ از راہِ تکلّف مخلوق سے تعلّق پیدا کرے۔ اس طریقے کے بعض صوفیا کا خیال ہے کہ اگر کسی صوفی پر سُکر کی حالت طاری نہ ہو تو وہ تکلّفاً بھی یہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ اس خیال کے صوفی اپنے نظریئے کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث

سے سند لیتے ہیں، جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "نماز کی حالت میں رویا کرو اور اگر رونا نہ آسکے تو رونے کی صورت بنالیا کرو۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ریاکاری کی وجہ سے ایسا کرتا ہے تو یہ قطعی طور پر شرک ہے اور جو شخص اپنی حالت کسی گروہ کے مشابہ اس لئے بناتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اسے بھی) اس گروہ میں شامل کر لے تو اسے چاہئے کہ اس گروہ کی طرح عبادت و ریاضت کے سارے طریقے اختیار کرے اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرے کہ وہ اس کے لئے حقائق معارف کے دروازے کھول دے۔

فرقہ جنیدی

یہ فرقہ ابو القاسم جنید بن محمدؒ سے وابستہ ہے جو اپنے عہد کے امام اور اس فرقہ کے سردار تھے، انھیں "طاؤس العلماءؒ" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ یہ "مسلک صحو" پر کاربند تھے۔ یہ مسلک صوفیا کے تمام مسالک میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اور بیشتر مشائخ اس مسلک کے پیرو تھے۔

صحو کا مطلب ہے ہوش و خرد، اس فرقے کے لوگ روحانی استفادہ کے لئے درویش کا ہوش میں ہونا ضروری قرار دیتے ہیں، چنانچہ جب حسین بن منصور سکر کے عالم میں عمرو بن عثمان سے قطع تعلق کر کے حضرت جنیدؒ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے دریافت کیا۔ آپ میرے پاس کسی غرض سے آئے

ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ سے روحانی استفادہ کرنے، حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ میرا مسلک تو "صحو" یعنی باہوش ہونا ہے اور میں سکر کے اہلِ طریقت کو اپنے گروہ میں شامل نہیں کیا کرتا، کیونکہ کچھ سیکھنے اور سمجھنے کے لئے انسان کا ہوش میں ہونا ضروری ہے۔

حسین بن منصور نے جواب دیا کہ "یا شیخ! صحو ہو یا سکر دونوں اللہ کے بندوں کی صفات ہیں اور بندہ جب تک اپنی صفات کو صفاتِ الٰہی میں فنا نہ کر دے اس وقت تک وہ بارگاہِ الٰہی سے دور اور جلوۂ ذاتِ حق سے محروم رہتا ہے۔

حسین بن منصور کا یہ بیان سن کر حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تیری نگاہ صحو اور سکر کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکی، صحو کہتے ہیں بندہ کا باہوش ہوتے ہوئے اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق رکھنا۔ اور یہ ایسی صفت نہیں کہ جسے مصنوعی طور پر اختیار کیا جائے اور پھر اسے صفاتِ خداوندی میں فنا کرنے کی کوشش کی جائے۔ صاحبِ سکر ہونے کی وجہ سے تیری گفتگو بے ربط اور لغو باتوں سے پر ہے۔ اور اگر تیرا طریقہ صحو کا ہوتا تو ایسی لایعنی گفتگو کبھی نہ کرتا۔

فرقہ نوری

یہ فرقہ ابوالحسن احمد بن نوریؒ سے عقیدت محبت رکھتا ہے۔

بزرگ طبقہ صوفیا میں جید عالم گذرے ہیں، یہ بڑی نورانی ہستی تھے، اور صوفیوں کے طبقے میں آپ کو بڑی عزّت اور بہت احترام سے یاد کیا جاتا ہے آپ نے تصوّف میں جس مسلک کی بناء رکھی وہ نہایت محبوب ہے، یہ مسلک اپنی صفتِ ایثار کے لحاظ سے نہایت محترم و ممتاز ہے اور اس صفت کے بغیر اس مسلک کے لوگ تصوّف کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے، ان لوگوں کا نظریہ ہے کہ ایسی دوستی اور صحبت قطعی حرام ہے جس میں دوسرے کے حقوق کو اپنے حقوق پر اور دوسرے کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح نہ دی جائے۔

اس فرقے کے امام ابوالحسن نوری رح کا ارشاد ہے کہ "اہل اللہ کی صحبت اختیار کرنا فرائض میں شامل ہے، اس طرح روحِ انسانی جلا پاتی ہے اور انسان گناہوں سے بچا رہتا ہے، اپنی ساتھی کی آرام اور اس کے مفاد کو اپنی آسائش اور اپنے فائدے پر مقدم رکھنا بھی فرائض میں شامل ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بار بار اس کی تاکید فرمائی ہے۔ اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ دنیا کو چھوڑ کر اور سب سے تعلقات منقطع کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی افادیت ہے، اسلام اسے ناپسند کرتا اور رہبانیت سے تعبیر کرتا ہے، پس لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی خدمت کرنی چاہیئے اور اپنے علم و عمل سے انھیں فائدہ اٹھانے کا موقع دینا چاہیئے۔"

فرقہ سہیلیہ

یہ فرقہ سہیل بن عبد اللہ تستریؒ کے متبعین پر مشتمل ہے۔ آپ صوفیاء کے گروہ میں ایک بزرگ شخص ہوئے ہیں۔ آپ کی طرف خلق کا بکثرت رجوع تھا۔ طریقت کے سارے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہ تھے اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کے حل کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ تصوّف میں آپ کا طریقہ جہاد بالنفس تھا۔ اور آپ روحانی کمال کے حصول کے لئے اپنے مریدوں کو اس کی تلقین فرماتے تھے، یہی طریق آپ کے متبعین نے بھی اختیار کیا۔

فرقہ حکیمیہ

یہ فرقہ اپنے آپ کو ابو عبداللہ بن علی حکیم ترمذیؒ سے منسوب کرتا ہے۔ ابو عبداللہ اپنے وقت کے امام اور علوم ظاہری و باطنی میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے، یہ صاحبِ تصنیف اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، انکے کا طریقِ تصوّف ولایت سے عبارت تھا۔ یعنی یہ تصوّف کے لئے ولایت کے اثبات کو ضروری سمجھتے تھے۔ ولایت کی حقیقت و ماہیت کے بیان میں انھیں کمال حاصل تھا، آپ نے اس کے بڑے نادر اور لطیف معنی بیان

کیے ہیں۔

فرقۂ خرازیہ

یہ فرقہ ابو سعید خرازؒ کا پیرو ہے۔ حضرت ابو سعیدؒ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، تصوف کی دنیا میں آپ دو نئی اصطلاحوں کے بانی ہیں، یعنی "فنا و بقا" آپ کے خیالات کے بنیادی عناصر یہی دو ہیں، اپنے منصوفانہ نظریات پیش کرتے ہوئے آپ نے انھیں دونوں اصطلاحوں یعنی "فنا و بقا" کی تصریح کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "فنا فی اللہ ہونے کا کمال یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو عبودیت کے آداب میں فنا کر لے اور بقا اسے کہتے ہیں کہ بندہ غیر اللہ سے انقطاعِ کامل کر کے حق تعالےٰ کی ذات کا اس طرح مشاہدہ کرے کہ اس میں گم ہو کر ہمیشہ کی بقا حاصل کر لے۔"

مطلب یہ ہے کہ بندہ بندگی کا عرفان اس وقت حاصل کرتا ہے جب وہ صرف دوسروں ہی کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی نظر انداز کر کے مشاہدۂ ذاتِ حق میں گم ہو جاتا ہے۔

فرقۂ خفیفیہ

یہ فرقہ ابو عبد اللہ محمد بن خفیف شیرازیؒ سے وابستہ ہے۔ ابن خفیف شیرازیؒ اپنے زمانے میں علومِ ظاہری و باطنی کے جید عالم اور اپنے فرقے

کے امام تھے، آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور یہ سب طریقت کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ شاہی خاندان کے ایک فرد اور صاحب امارت و دولت تھے۔ ایک زمانہ آپ پر ایسا بھی گزرا ہے جب آپ کے حرم میں چار سو بیویاں تھیں۔ مگر پھر آپ نے توبہ کر لی۔ اور شیراز کے ایک بزرگ کی بیعت کر کے خواہشاتِ نفسانی سے یکسر منہ موڑ لیا۔ اس کے بعد آپ نے ایسے روحانی مدارج طے کئے، کہ آج آپ کے فضائل احاطۂ بیان سے باہر ہیں۔

آپ نے ایک نیا مکتبِ تصوف قائم کیا، جس کی بنیاد "غیبت و حضور" پر ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ دل کا ایسے یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا کہ گویا خداوند تعالیٰ آنکھوں سے نظر آ رہا ہے یہ حضور ہے۔ غیبت سے مراد یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے سوا ہر شے سے دل غائب ہو جائے، حتیٰ کہ انسان خود اپنے آپ سے بھی غائب ہو، پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اپنی غیبت سے بھی غائب ہو۔ جب ایک شخص اپنے آپ سے غائب ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگیا اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگا۔ تو لازماً اپنے آپ سے غائب ہوگا۔

فرقہ سیاریہ

یہ فرقہ ابو العباس سیاریؒ کے وابستگان پر مشتمل ہے، وہ مقام مرد

میں اپنے عہد کے امام تھے اور تمام علوم متداولہ کے عالم تھے۔ آپ نے حضرت ابو بکر واسطیؒ کا زمانہ پایا تھا، اور اُن کے خاص ہم نشینوں میں سے تھے۔ تصوّف کے تمام مکاتب میں ایک یہی مکتبۂ فکر ہے جس کی تعلیم آج بھی بجنسہٖ موجود ہے یہ اس لئے ہے کہ اس مسلک کے متبعین کا اقتدار ہر زمانے میں قائم رہا اور نساء و مرد میں اس کے پیرو بکثرت موجود رہے ہے اس مذہب کی بنیاد مسئلہ "جمع وتفرقہ" پر ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے تمام بندوں کو اس دعوت میں جمع کیا کہ واللّٰہ یدعوا الیٰ دار السلام (خدا تعالیٰ تمہیں دار السلام یعنی سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے) یہ جمع ہے۔ تفرقہ یہ ہے کہ ویہدی من یشاءُ الی صراطٍ مستقیم (اللہ تعالیٰ جس کی چاہتا ہے راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے) آیت اوّل میں اللہ تعالےٰ تمام انسانوں کو اپنے گھر کی طرف جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ آیتِ دوم کے مطابق ایک جماعت کو ہدایت دیتا ہے اور ایک گروہ کو رد کرتا ہے۔ پس پہلی صورت جمع کی اور دوسری تفرقہ کی ہے اور یہی فرقۂ سیارہ کے مذہب کی اصل ہے۔

فرقہ حلولیہ

اس فرقے کے لوگ نہایت باطل خیالات رکھتے ہیں جو اجماعِ اُمت کے

بالکل خلاف ہیں۔ ان پر خدا کی لعنت ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے دو گروہ ہیں ایک گروہ ابو حلمان دمشقی کا پیرو ہے اور دوسرا اپنے آپ کو حسین بن منصورؒ سے وابستہ کرتا ہے۔ ابو حلمان دمشقی کے متبعین اپنے مرشد سے ایسے عقائد منسوب کرتے ہیں جو اقوالِ مشائخ کے بالکل خلاف ہیں، صوفی لوگ تو ابو حلمان دمشقی کو صاحب باطن اور اہلِ اللہ میں شامل کرتے ہیں لیکن ملحدین کا گروہ ان کی طرف حلول اور تناسخ کے مسائل منسوب کرتا ہے، میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ ابو حلمان کون ہے اور فارسی (حسین بن منصور) کس کا نام ہے اور ان کے اقوال کیا ہیں؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو توحید کے مخالف عقائد اختیار کرتا ہے وہ بالکل ملحد اور بے دین ہے۔

اصطلاحاتِ صوفیہ

ایسا کوئی علم نہیں ہے جس کی کچھ خاص اصطلاحیں نہ ہوں۔ یہ اصطلاحیں ان علوم کے علماء نے اس لئے وضع کی ہیں تاکہ اظہارِ خیال میں آسانی ہو اور مفہوم اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے۔ علم تصوف کے مدونوں اور علماء نے بھی کچھ اصطلاحیں وضع کی ہیں تاکہ باطنی کیفیات و واردات کی تشریح کی جا سکے۔ اب میں اختصار کے ساتھ ان اصطلاحات کی وضاحت

کروں گا۔

قبض وبسط

قبض وبسط اُن دو مختلف کیفیتوں کا نام ہے جو صوفی کے دل پر وارد ہوتی ہیں۔ قبض کہتے ہیں تنگی کو اور بسط کہتے ہیں کشادگی کو، یہ دونوں کیفیتیں دل سے متعلق ہیں۔ اور انسانی کوشش سے وارد نہیں ہوتیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ واللہ یقبض ویبسُط ہ (اللہ تعالیٰ ہی تنگی پیدا کرتا ہے اور وہی کشادگی عطا فرماتا ہے) قبض سے مراد یہ ہے کہ مشاہدہ ذاتِ حق سے حجاب ہونے کی وجہ سے روح پر اذیت ہونا اور بسط سے مراد یہ ہے کہ مشاہدہ ذاتِ حق ہونے کی وجہ سے روح میں انبساط وسرور پیدا ہونا میرے مرشد فرماتے تھے کہ نتیجہ اور اثرات کے اعتبار سے قبض وبسط دونوں ایک ہی سی کیفیتیں ہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں حالتوں کو اللہ تعالےٰ ہی اپنے بندہ کے دل پر وارد فرماتا ہے، قبض کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ متلاشیٔ حق کے دل میں اور زیادہ کشادگی پیدا ہو اور اسے اور زیادہ کیف روحانی حاصل ہو، گویا ایک لحاظ سے قبض بھی بسط بلکہ عینِ بسط ہے۔ حضرت بایزیدؒ کا ارشاد بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ دل کی قبض نفس کی بسط میں پوشیدہ ہے۔

اور نفس کی بسط دل کی قبض میں پوشیدہ ہے۔

اُنس وہیبت

یہ بھی دو کیفیتوں کا نام ہے جو طالبان حق کے دل پر وارد ہوتی ہیں جب اللہ تعالےٰ کسی بندہ کے دل پر اپنی صفتِ جلالی کے ساتھ تجلّی فرماتا ہے تو اس پر ہیبت طاری ہوتی ہے اور جب صفت جمال کے ساتھ تجلّی بار ہوتا ہے تو کیفیت انس وارد ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو اس کے جمال کے ذریعہ سے کیفیتِ انس نصیب ہوتی ہے انھیں سُرور ملتا ہے اور جنھیں کیفیتِ جمال کے نزول کی وجہ سے ہیبت نصیب ہوتی ہے انھیں رد وکرب برداشت کرنا پڑتا ہے یہ فرق ہے اس دل میں جو اللہ تعالےٰ کی تابش جلال سے بریاں ہوتا ہے اور اس دل میں جو صفتِ جمال سے منوّر ہوتا ہے

فنا وبقا

یہ دونوں اصطلاحیں بھی تصوّف کی ہیں، قرآن حکیم میں بھی متعدد آیات ایسی موجود ہیں جن سے ان اصطلاحوں کے معنی کا تعیّن ہوتا ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ ما عندکم ینفد وما عند اللہ باقٍ ہ (جو کچھ تمہارے پاس ہے فنا ہوجانے والا ہے اور جو کچھ اللہ تعالےٰ

کے پاس ہے وہ ہمیشہ ہمیش باقی رہنے والا ہے) پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی ذات کے سوائے کائنات کی ہر شے فنا کی دست بُرد میں ہے اور تمام موجوداتِ عالم میں حرف ہستیٔ باری تعالیٰ ایسی ہستی ہے جو فنا کی زد سے کامل طور پر محفوظ رہنے والی ہے جس طرح اللہ تعالےٰ کی ہستی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اسی طرح اسکی صفات بھی ہر قسم کے تغیّر و تبدّل اور فنا و زوال سے مبرا ہیں۔ اس کی یہ صفات اس کی ذات کی طرح قدیمی ہیں، اس کی مخلوق میں سے کوئی اس کی صفات میں کسی قسم کی شرکت نہیں رکھتی۔

یہ تو فنا اور بقا کے عام معنیٰ ہیں لیکن تصوّف و طریقت میں یہ الفاظ بالکل مختلف معنیٰ رکھتے ہیں۔ اہلِ تصوّف کے نزدیک فنا کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا جہل اور عدم علم کی کیفیت فنا ہو جائے، جب جہل و عدم علم فنا ہو جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ علم و باخبری یا علم و عرفان باقی رہا۔ کیونکہ جب ہم کہیں کہ عدول حکمی و غفلت فنا ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اطاعت گذاری باقی ہے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے علم سے آراستہ ہو جاتا ہے تو گویا اس کے علمِ معرفت کی وجہ سے وہ بھی اس کے ساتھ باقی ہوتا ہے اور اپنے جہل کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتا ہے تو اس تعلق کے ساتھ باقی ہوتا ہے اور تعلقاتِ دُنیا کے ساتھ

فانی ہوتا ہے، اسی طرح جب بندۂ عشقِ الٰہی کے ساتھ مستغرق اور باقی ہوتا ہے تو غیر اللہ کے عشق کے ساتھ فانی ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ تمام قابلِ تعریف اوصاف کو اُبھارنے کے ساتھ تمام برے اوصاف کو دبانا اور ان سے دامن کش رہنا ضروری ہے، اور جب ایک شخص کا ماسوائے اللہ سے فنا ہو کر ذاتِ حق سے وصل ہوگیا تو اس کا وجود اللہ تعالےٰ کی ذات کا جزو بن گیا۔ کیونکہ جب قطرہ اپنی ہستی کو نیست کر کے دریا میں ملتا ہے تو دریا بن جاتا ہے۔

حال و مقام

یہ بھی اہلِ تصوّف کی اصطلاح ہے اور جان لینا چاہیئے کہ مقام میم پر پیش کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے کسی مرحلے پر قائم رہنے کو کہتے ہیں، اور میم پر زبر کے ساتھ یہ لفظ جائے قیام کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت کی غلطی اور مطالعہ کی خامی کی وجہ سے ان دونوں الفاظ کے معنی میں فرق نہیں کیا جاتا، اور واضح ہو کہ جب انسان اطاعتِ حق کے کسی مرحلے پر قائم ہو جائے تو اس مقام کے حقوق ادا کرنا اس کیلئے ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ درجۂ کمال کو پہنچ جائے اور جب اللہ تعالےٰ کسی بندہ کو کسی مقام پر فائز کردے تو اس مقام کے فرائض سے لاپرواہی

اس کے لئے جائز نہیں، اور دیکھا گیا ہے کہ آغازِ توبہ میں بعض ایسے مقام آتے ہیں، جب لوگوں سے اس قسم کی لاپرواہی سرزد ہو جایا کرتی ہے۔ توبہ کے بعد پھر ایک مقام آتا ہے جو رجوع الی اللہ کا مقام کہلاتا ہے، اس کے بعد زہد کا مقام آتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز ترک کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مقام توکل آتا ہے جس کا مطلب ہے ذاتِ خداوندی پر اعتمادِ کامل۔ یہ سب مقامات ہیں اور ان میں سے آخری مقام توکّل کا ہے۔

اب حال کے مفہوم پہ غور کرو، حال اس کیفیتِ معنی کا نام ہے، جو قلبِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہوتی ہے۔ اور کسی شخص کی مجال نہیں کہ جب یہ کیفیت وارد ہو جاتی ہے تو وہ اسے اپنے سے دور کر سکے اور جب دل پہ نازل ہونے والے معنیٰ پرواز کرنے لگیں تو کوئی شخص اپنی کوشش و اختیار سے ان کو گرفت میں نہیں لا سکتا، گویا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جد و جہد کر کے انسان جو درجہ حاصل کرتا ہے، وہ مقام کہلاتا ہے۔ یعنی مقامِ انسانی کوشش سے حاصل ہوتا ہے اور حال اس کیفیت کو کہتے ہیں جو بغیر کوشش کے نزولِ معنیٰ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ اس حال میں انسان پر بڑے لطیف روحانی نکات اور باطنی اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔

سُکر و صحو

طالبانِ علمِ تصوّف کے لئے اس اصطلاح کا سمجھنا بے حد ضروری ہے صحو کے لغوی معنٰی ہوش و خرد اور سُکر کے لغوی معنٰی ازخود رفتگی یعنی بے ہوشی کے ہیں، اہلِ تصوّف سُکر اس عالم کو کہتے ہیں جب صوفی پر عشقِ الٰہی کا ایسا شدید غلبہ ہوتا ہے کہ وہ دُنیا و مافیہا حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور صحو اس عالم کو کہتے ہیں جب وہ عشق الٰہی میں سرشار ہوتے ہوئے عبادات کی پابندی کرتا ہے۔ یعنی عشق الٰہی میں اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھتا ہے اور نماز اور اوراد قضا نہیں ہوتے، صوفیا اور علماء کا ایک گروہ سُکر کو صحو پر اور دُوسرا صحو کو سُکر پر فضیلت دیتا ہے۔ جاننا چاہئے کہ صحو یعنی عالم ہوش و خرد میں جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ بندہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور جو افعال سُکر یعنی ازخود رفتگی اور بیہوشی کے عالم میں سرزد ہوتے ہیں؛ وہ اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ یہ ثبوت اس امر کا ہے کہ سُکر کو صحو پر فضیلت حاصل ہے لیکن برعکس اس کے حضرت جنیدؒ اور آپ کے ہم خیال اصحاب کا خیال ہے کہ سُکر پر صحو کو فضیلت حاصل ہے اور وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ سُکر یعنی عالمِ مدہوشی میں بڑے خطرات ہیں، کیونکہ صاحب صحو اس عالم میں ہوش و خرد سے

عاری ہوتا ہے اور جب عقل و فہم میں سے محروم ہوتا ہے تو ظاہر ہے، کہ ضروریاتِ دین اور مسائل دین کا ادراک بھی نہیں کر سکے گا، مشاہدۂ کائنات اور علمی و فکری ترقی کے دروازے بھی اس پر بند ہو جائیں گے، اور یہ بہت بڑی آفت ہے۔

میرے مرشد جو حضرت جنیدؒ کے ہم مسلک تھے، فرمایا کرتے تھے کہ سکر (بیہوشی) بچوں کا کھیل ہے اور صحو (ہوش و خرد) عالم باطنی کے مردانِ کار کے لئے ہے۔ اور میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں، اپنے مرشد کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ صاحبِ سکر اپنے باطن میں پختہ کار ہونے کے بعد کمالِ صحو حاصل کرتا ہے۔ یعنی کمال سکر میں نہیں بلکہ صحو میں ہے۔

نفی و اثبات

تصوف میں خواہشاتِ انسانی کو ترک کر دینے کا نام نفی اور اللہ تعالےٰ کی رضا کی تائید ثابت کرنے کا نام اثبات ہے۔ نفی بشریت کی نفی اور اثبات رضائے الٰہی کا اثبات ہے، بشریت کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالےٰ کا اختیار و اقتدار ثابت کیا جائے، جیسا کہ حضرت موفقؒ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ کو اپنے بندہ پر کامل اختیار حاصل ہے اور بندہ اپنے لئے جو اختیار کرتا ہے اس سے وہ اختیار کہیں بہتر ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنے

بندہ کے لئے ہو، وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی مشیت اور اس کے معاملات کے متعلق امتحان کا علم ناقص ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے وہ علم کامل کے ساتھ ہوتا ہے۔

علمائے تصوّف فرماتے ہیں کہ طریقت میں اختیارِ انسانی کی نفی کمتر درجے پر ہے یہ اس لئے کہ بندہ کو جو اختیار دیا گیا ہے۔ وہ عارضی ہے اور اگر اس کی نفی کو جائز کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ لیکن جو اختیار اللہ تعالےٰ کو حاصل ہے وہ ہمیشہ رہے گا۔ جس کی نفی ممکن ہو ہی نہیں سکتی، پس بندہ کی سعادت مندی کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کو جو عارضی ہے، اللہ تعالےٰ کے اس اختیار پر جو ازلی و ابدی ہے، قربان کر دے۔

مسامرہ و محادثہ

یہ دونوں اُن دو باطنی کیفیتوں کے نام ہیں جو سالکانِ راہِ حق کے دل پر وارد ہوتی ہے۔ مسامرہ رات کے اس وقت کو کہتے ہیں جب بندہ اپنے مولا کے ساتھ مصروفِ راز و نیاز ہوتا ہے اور اس کیفیت کے اظہار سے روکا گیا ہے۔ محادثہ دن کے اوقات میں سے وہ وقت ہے جب بندہ اپنے آقائے حقیقی کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہوتا ہے۔ گویا دن کا معاملہ کشف سے تعلق رکھتا ہے یعنی ظاہری حالات سے اور رات کا معاملہ سِر

یعنی پوشیدہ حالت سے متعلق ہوتا ہے۔ اور محبت میں مسامرہ کی کیفیت محادثہ کی کیفیت کے مقابلے میں کامل ہوتی ہے۔ مسامرہ کی وہ کیفیت جو درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالےٰ نے آپ کو ایک رات مکہ مکرمہ سے اپنے عرش تک پہنچا دیا اور آپ سے راز و نیاز کی گفتگو فرمائی اور آپ کی زبان پر بیساختہ یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ — لا احصی ثناءً علیک (میں تیری ثنا کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں) یہ تو تھا مسامرہ مگر مسامرہ کا انتہائی مقام —

محادثہ کا انتہائی مقام وہ تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ سے کلام کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی اور چالیس روز گذارنے کے بعد دن کے وقت کوہ طور پر گئے اور کلام الٰہی سے شرفیاب ہونے کے بعد درخواست کی اے مولا کریم! مجھے اپنا روئے مبارک دکھلائیے، مگر جیب اللہ تعالیٰ نے تجلّی فرمائی تو آپ بے ہوش ہو گئے، ہوش میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ تبت الیک (میں تجھ سے رجوع کرتا ہوں) یعنی میں نے جو ارادہ کیا تھا کہ مجھے اپنی تجلّی دکھلائیے، اس ارادے سے رجوع کرتا ہوں!

یقین

یقین کے تین درجے کئے گئے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین — اور

حق الیقین، علم الیقین علم کا وہ درجہ ہے جس میں کسی چیز کے وجود کا یقینی علم ہو کہ وہ ہے۔ عین الیقین علم کا وہ درجہ ہے جس میں کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین ہو جائے کہ واقعی وہ موجود ہے اور حق الیقین نام ہے اس اطمینانِ قلب کا جو کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہر مسلمان کو جنت کے وجود اور اس کی نعمتوں پر یقین ہے، حالانکہ اس نے بہشت اور اس کی نعمتوں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے۔ اُسے یہ یقین قرآن و حدیث کی رُو سے حاصل ہوا ہے۔ یہ علم الیقین کہلائے گا۔ پھر جب ہم جنّت اور اس کی نعمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو یہ عین الیقین کا درجہ ہو گا اور اس عین الیقین کو جنّت کے وجود کا مشاہدہ کر کے جو تصدیق حاصل ہو گی وہ حق الیقین کہلائے گی۔ اور معلوم ہونا چاہیئے کہ تصوّف کی ان اصطلاحوں کا مشاہدۂ حق سے بڑا گہرا تعلق ہے، اس لئے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات پر پورا یقین نہیں رکھے گا تو اس کے دل میں روزِ قیامت دیدارِ الٰہی کی سچی تڑپ بھی پیدا نہیں ہو گی۔ سو جاننا چاہیئے کہ عین الیقین نتیجہ ہے علم الیقین کا اور حق الیقین نتیجہ ہے عین الیقین کا، اور علم الیقین علماء کا مرتبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ احکامِ الٰہی پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ عین الیقین عارفوں کا درجہ ہے کہ ان میں جلوۂ حق کے دیکھنے اور اسے برداشت کرنے کی صلاحیت و قوّت ہوتی ہے۔

اور حق الیقین مقام ہے اولیا کا کہ وہ اللہ تعالےٰ کی محبت میں اس کی ذات کے سوائے باقی تمام موجودات سے قطع تعلق کر لیتے ہیں. علم الیقین سعی و کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے. عین الیقین انس و تعلق سے اور حق الیقین مشاہدہ و مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے.

علم و معرفت

علما کے نزدیک علم اور معرفت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ان کے خیال میں دونوں ایک ہی ہیں اس لئے کہ علم کے بغیر حصولِ معرفت ممکن ہی نہیں. البتہ انھوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ عالم کو عالم کہنا چاہئے عارف نہیں اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم اور معرفت میں فرق ضرور ہے اور مشائخ کا خیال ہے کہ علم وہ ہوتا ہے کہ جو کسی چیز کی رسمی اور ظاہری معلومات تک محدود ہوتا ہے اور اس کے جاننے والے کو عالم کہتے ہیں. معرفت یہ ہے کہ کس چیز کی حقیقت اور ماہیت اور اس کی باطنی کیفیات سے آگہی حاصل کی جائے. اس علم کے عالم کا نام عارف ہے. اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ایک شخص صرف عبادت کے رسمی طریقے پر قائم رہے اور اس کی حقیقت اور حقیقی معنی اس پر منکشف نہ ہوں وہ عالم تو ضرور ہوگا مگر عارف نہیں ہوگا اور عارف وہ ہوگا جو عبادت کے رسمی طریقے پر بھی قائم ہو اور اسکے ساتھ ساتھ اسکی حقیقت اور اسکے معنی سے بھی باخبر ہو گویا عالم کیلئے صرف علم اور عارف کے لئے علم کے ساتھ ساتھ علم کی

حقیقت اور اشیاء کی معرفت بھی ضروری ہے۔

قہر و لطف

قہر اور لطف دونوں دراصل اللہ تعالےٰ کی صفات ہیں اور ان صفات کا عکس صوفیوں کے قلب پر بھی پڑتا ہے، بعض صوفیوں کے دل میں اللہ تعالےٰ کی صفتِ قہر منعکس ہوتی ہے اور بعض میں اس کی صفتِ لطف حکایت میں آتا ہے کہ بغداد میں دو صوفی رہتے تھے۔ جن میں سے ایک صفتِ قہر سے متصف تھا اور دوسرا صفتِ لطف سے۔ ان دونوں میں چشمک رہا کرتی تھی، صاحبِ لطف کہتا تھا کہ لطف کی صفت کو فضیلت حاصل ہے اور دلیل اس کی یہ دیتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔

اللّٰہ لطیف لعبادہٖ (خداوند کریم اپنے بندوں کے لئے صاحبِ لطف ہے) یعنی اپنے بندوں کے حال پر کرم فرماتا ہے۔ دوسرا صوفی جو صاحبِ قہر تھا، کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالےٰ کی صفتِ قہر افضل ہے، چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ وھو القاھر فوق عبادہٖ (اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے قاہر ہے) غرض اس طرح ان دونوں کے درمیان بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک صوفی جو صاحب لطف تھا عازمِ مکہ معظمہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے ایک جنگل میں قیام کیا اور پھر وہیں رہ پڑا،

اس جنگل میں وہ کئی برس ریاضت و مجاہدہ کرتا رہا، ایک دن اس طرف سے ایک شخص گذرا جو مکہ سے بغداد جا رہا تھا۔ صاحب لطف صوفی نے اس سے کہا کہ عراق پہنچ کر بغداد کے محلہ کرخ میں فلاں صوفی کو میرا یہ پیغام دیدینا کہ اگر تو ویرانے میں اپنے شہر سے زیادہ عجائب و غرائب دیکھنا چاہے تو میرے پاس چلا آ، میں نے اس جنگل میں اپنے لئے کرخ و بغداد پایا ہے مسافر کا پیغام سن کر صاحب قہر صوفی نے اس سے کہا کہ جب تمہارا ادھر سے دوبارہ گذر ہو تو اس صوفی سے کہنا کہ یہ کوئی کمال و شرف نہیں کہ تیرے حق میں جنگل بیابان بغداد ہو گیا ہے۔ باعث شرف تو یہ امر تھا کہ تو بغداد کے علاقہ کرخ میں رہتا اور پھر یہ محلہ تیرے لئے جنگل بیابان ہو جاتا۔

غرض کہنے کا مدعا یہ ہے کہ بندہ سے جو اعمال ظہور پذیر ہوں گے ان کی دو ہی صورتیں ہوں گی یا تو وہ اللہ تعالےٰ کی صفت قہر سے ظاہر ہوں گے یا صفت لطف سے جو بات ہم اپنے لئے پسند کریں یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالےٰ کا ارادہ بھی اس کے تابع ہو، میں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا اور اللہ تعالےٰ نے مجھے نفس کے ابتلاؤں سے بچا لیا، اگر اللہ تعالےٰ میرے لئے حالت قہر پسند کرے تو میں آرزوئے لطف نہیں کرتا اور اگر وہ میرے لئے حالت لطف پسند کرے تو میں آرزوئے قہر نہیں کرتا، یہ اس لئے ہے کہ بندہ مجبور ہے، مختار نہیں اور اللہ تعالےٰ نے نظام عالم کے سارے

اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں.

شریعت و حقیقت

یہ دونوں اصطلاحیں بھی اہلِ تصوّف و طریقت استعمال کرتے ہیں، شریعت سے مراد ہے اعمال و معاملات میں احکام شرع کی پابندی اور طریقت نام ہے احوالِ باطن کی درستی کا۔ شریعت اور حقیقت کے متبعین نے اپنے آپ کو دو الگ الگ گروہوں میں بانٹ رکھا ہے اور یہ دونوں راہ راست سے ہٹ گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ شریعت ہی حقیقت ہے، یعنی شریعت کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ دوسرا گروہ جسے ملاحدہ کا گروہ کہنا چاہیئے۔ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ جب صوفی پر حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے تو اس پر سے شریعت کی پابندی اُٹھ جاتی ہے۔ لیکن یہ نہایت گمراہ کن نظریہ ہے، خواہ حقیقت کے سارے پردے اُٹھ جائیں، شریعت کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ انبیاء سے زیادہ اور کس پر حقیقت کا انکشاف ہوا ہوگا، لیکن شریعت کی پابندی سے وہ بھی مستثنیٰ نہ ہوئے۔ حقیقت در اصل نام ہے تمام ظاہری اور باطنی معاملات کی درستی اور تکمیل کا اور یہ تزکیۂ قلب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اور تزکیۂ قلب تصوف کی بنیاد ہے۔ گویا حقیقت کے لئے

شریعت کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ بلکہ شریعت کے بغیر حقیقت کا مشاہدہ ہو ہی نہیں سکتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے کہ شریعت کے قیام کے لئے حقیقت کے آداب کی پابندی بھی ضروری ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ شریعت اور حقیقت کو روح اور جسم کی حیثیت حاصل ہے، جس طرح جسم بغیر روح کے مردہ ہے۔ اور روح بغیر جسم کے افعال و اعمال کو معرضِ ظہور میں لانے سے قاصر ہے۔ اسی طرح شریعت و حقیقت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

مختصر الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ شریعت نام ہے مجاہدہ کا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندہ کی جو باطنی رہنمائی کی جاتی ہے وہ حقیقت ہوتی ہے۔ گویا شریعت سراسر کسب سے تعلق رکھتی ہے اور حقیقت وہبی چیز ہے۔ ان امور کو سمجھانے کے لئے صوفیا نے کچھ استعارے یا اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ اب میں ان استعارات کی وضاحت کرتا ہوں۔

اصطلاحاتِ شریعت و حقیقت

الحق: اہلِ باطن اس سے ذاتِ خداوندی مراد لیتے ہیں، کیوں کہ وہ اوّل سے آخر اور ظاہر سے باطن تک حق ہی حق ہے، اور حق اللہ تعالےٰ نے اپنے ناموں میں سے ایک نام بھی رکھا ہے

الحقیقت:۔ وہ مقامِ عرفان جب بندہ اللہ تعالےٰ سے واصل ہو جاتا ہے۔

المضرات:۔ اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کرنے سے دل پر جو اثراتِ خبیثہ وارد ہوتے ہیں۔

الوطنات:۔ مسلسل اذکارِ الٰہی اور عبادت کرنے سے قلب پر جو اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

العلائق:۔ وہ علائق دنیوی جن کی وجہ سے بندہ راہِ حق سے بھٹک جائے۔

الوسائط:۔ وہ اسباب و وسائل جن کے ذریعہ سے بندہ اپنے آقا کو پا لیتا ہے۔

الزوائد:۔ کثرتِ اذکار و عبادات سے قلب میں سرورِ روحانی کا بڑھنا۔

الفوائد:۔ پیدائش انسانی کے اسرار و رموز اور زندگی کے دوسرے رازوں تک رسائی۔

الملجاء:۔ اللہ تعالےٰ کی طرف رجوعِ قلب اور اعتمادِ کامل۔

النجا:۔ محلِ آفات سے رہائی قلب، جو کثرتِ ورد سے حاصل ہوتی ہے۔

الکلیت:۔ کائنات اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ اپنی ذات سے بھی قطع نظر کر کے ذاتِ خداوندی کی صفات میں استغراقِ

کاملہ۔

اللوائحُ:۔ ہر قسم کے شرک کی نفی اور ذاتِ واحد کا اثبات۔

اللوامح:۔ دل کا اس کے فوائدِ باطنی کے ساتھ نور سے بھر جانا۔

الطوالع:۔ قلب پر انوارِ معرفت کا طلوع اور تیرگیٔ شبہات کا ازالہ

الطوارق:۔ دل پر اُن وارداتِ باطنی کا نزول جو اوقاتِ شب میں مناجات کے دوران بشارت یا تنبیہہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

السِر:۔ ان اسرار کو پوشیدہ رکھنا جو وصلِ الٰہی کے بعد منکشف ہوتے ہیں۔

التجوی:۔ اللہ تعالیٰ سے آفات و حوادث کی اطلاع پاکر انھیں پوشیدہ رکھنا اور ان کے دُور کرنے کی کوشش کرنا۔

الاشارہ:۔ ایمان و اعتقاد کی حفاظت اور روحانی ارتقا کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے اشاراتِ مخفی۔

الآیاء:۔ صوفی یا ولی سے اللہ تعالےٰ کا ایسا تخاطب جو اشارہ و عبارت کے بغیر ہو،

الاشراق:۔ قلب پر انوارِ الٰہی کا بکثرت نازل ہونا۔

الوارد:۔ معانی کا قلب میں اُتر جانا۔

الانتباہ:۔ اللہ تعالےٰ کا بندہ کو متنبہ کرنا اور غفلت کا زائل ہونا۔

الاشتباہ:۔ وہ شبہات ومشکلات جو حق وباطل میں تفریق کرتے ہوئے پیش آتی ہیں۔

القرار:۔ حال کی حقیقت سے تردد اور اضطراب دور ہو کر اطمینانِ قلب نصیب ہونا۔

الانزعاج:۔ حالتِ وجد میں دل کی حرکات وسکنات۔

العالم:۔ وہ تمام مخلوقات وموجودات جو اللہ تعالےٰ نے پیدا کی ہیں،

القدیم:۔ وہ ہستی جو تمام ہستیوں سے پہلے اور ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ اللہ تعالےٰ سے مراد ہے۔

المحدث:۔ وہ وجود جو بعد کو پیدا ہوا ہو اور فنا کی زد میں ہو۔ مخلوقات وموجودات سے مراد ہے۔

الازل:۔ جس کی ابتدا کا سراغ نہ لگ سکے،

الابد:۔ جس کی انتہا کی کوئی حد نہ ہو۔

الذات:۔ کسی شے کی ہستی اور اس کی حقیقت۔

الصفت:۔ وہ حقیقت جو قائم بالذات ہو اور کسی تغیر سے اثر پذیر نہ ہو۔

النفی:۔ عدمِ منفی کا متقاضی۔

الاثبات:۔ وجودِ مثبت کا متقاضی۔

السیان :- ایک وجود کا دوسرے وجود کے ساتھ لازم ہونا۔

الضدان :- ایک کا وجود دوسرے کے وجود کی بقا کے ساتھ لازم نہ ہو

الغیران :- ایک شے کا وجود بغیر دوسری شے کے روا ہو۔

الجواہر :- ایک چیز کا اصل جو اس کی ذات میں قائم ہو۔

الجسم :- منتشر اجزا کا مجموعہ،

العرض :- جو قائم بالجوہر ہو۔

السوال :- طلب حقیقت و صداقت،

الجواب :- سائل کے مفہوم سوال کو مدِ نظر رکھ حقیقت سے مطلع کرنا۔

الحسن :- قابلِ تعریف، خوشگوار اور مطابق امرِ ربی۔

القبح :- مخالفِ الحسن، جو مکروہ ہو،

السفہ :- ترک رمزا انحرافِ شریعت :

الظلم :- کسی شے کو اس کی شایانِ شان جگہ نہ رکھنا۔

العدل :- کسی شے کو اس کی شایان شان جگہ رکھنا۔

الملک :- وہ ہستی جس کے کسی فعل پر اعتراض نہ ہو، اللہ تعالیٰ۔

الخاطر :- ایسے معنی کا دل میں آنا جو پوشیدہ ہوں۔

الواقع :- دل پر وارد ہونے والا وہ امر کہ طالب جس کے دور کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو،

الاختیار :۔ اپنے اختیار کو معاملہ خیر و شر میں اختیار خداوندی پر ترجیح دینا۔

التحلی :۔ تنہا ہونے کے باوجود روحانی قوت کے ذریعہ سے اپنے آپ کو کسی جماعت جیسا بنانا، مگر یہ تصنع سے نہ ہو۔

التجلی :۔ عرفانِ الٰہی کے انوار کا قلب پر نزول اور ان کی تاثیر،

التخلی :۔ ان مشاغل سے دامن بچانا جو بندہ اور خدا تعالےٰ کے درمیان حائل ہوتے ہوں۔

الشرود :۔ آفات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اعانتِ الٰہی کی طلب اور اس میں بیقراری۔

القصود :۔ طلبِ مقصود کے لئے عزم و ارادہ کی صحت،

الاصطناع :۔ تہذیبِ نفس کیلئے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو نعمتیں دے کر واپس لے لینا۔

الاصطفاع :۔ بندہ کی وہ کیفیت حب اللہ اس کے دل کو اپنی معرفت کے لئے مخصوص کر لے،

الاصطلام :۔ بندے کا ایک ایسا لطیف امتحان جسمیں غلبۂ خداوندی سے انسانی ارادے کی نفی کی جاتی ہے،

الرین :۔ دل کا وہ حجاب گمرہی جو ایمانِ کامل کے بغیر دور نہیں ہو سکتا

الغین :۔ دل کا وہ حجاب کثیف جو توبہ و استغفار سے ہٹ جاتا ہے

التلبیس :۔ کسی شئے کو اس رنگ میں ظاہر کرنا جو اس کی حقیقت کے

خلاف ہو۔

الشرب:۔ اصطلاح صوفیاء میں شیرینئ اطاعت اور محبت کی راحت کا نام ہے۔

الذوق:۔ شرب ہی کا ہم معنیٰ ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ شرب صرف کیفیت راحت کے لئے بولا جاتا ہے مگر ذوق راحت اور رنج دونوں کیفیتوں پر محیط ہے۔

عظمتِ علم

اللہ تعالےٰ علماء کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ۔ اللہ کے بندوں میں علماہی ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم علم کے متعلق فرماتے ہیں کہ اطلبوا العلم ولو کان بالصین (علم حاصل کرو، خواہ اس کے لئے تمہیں چین کا سفر کرنا پڑے)

اس سے علم اور علما دونوں کی اہمیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ مگر انسان کی عمر قلیل اور علوم کثیر بلکہ بے شمار ہیں، اور ظاہر ہے کہ تمام علوم کا حاصل کرنا کسی ایک انسان کے لئے محال بلکہ ناممکن ہے مگر ان علوم کا حاصل کرنا بے حد ضروری ہے جن سے دین اور شریعت سے مکمل آگاہی ہو سکے اور

اعمال درست ہوسکیں، واضح ہو کہ ایسے علوم کا سیکھنا جن سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو درست نہیں چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ

• ویتعلمون مایضرھم ولا ینفعھم۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ ان لوگوں کا ذکر مذمت کے پیرایے میں کرتا ہے جو ایسے علوم کی تحصیل میں وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ جو انھیں ضرر پہنچاتے ہیں۔ اور جن سے انھیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ آں حضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غیر نافع علوم سے پناہ مانگتے تھے، چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں، کہ

• اعوذبک من علم لاینفع (اے اللہ میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں وہ علم سیکھنے سے جو کوئی فائدہ نہ پہنچائے)

پس خواہ علوم تھوڑے حاصل کئے جائیں لیکن ان کے ساتھ عمل کثیر ہونا چاہیئے اور عمل علم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو، آں حضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ایسا عبادت کرنے والا جو بے شعور اور علم سے تہی دامن ہو، خراس کے اس گدھے کی طرح ہے جو صبح سے شام تک چلنے کے باوجود ایک ہی جگہ پر رہتا ہے۔

میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ علم کو عمل سے افضل قرار دیتے ہیں، اور بعض عمل کو علم پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ دونوں غلطی پر ہیں کیونکہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے بغیر علم کے اس کی کچھ حقیقت نہیں جب تک

کوئی شخص اس چیز کی اصل حقیقت اور معنی ومنشا سے باخبر نہ ہو جس پر وہ عمل کر رہا ہے، اس وقت تک وہ اجر و ثواب کا حقدار نہیں ہو سکتا، مثال کے طور پر اگر ایک نماز پڑھنے والے کو نماز کے ارکان، طہارت کی شرائط قبلے کی شناخت اور نیت وغیرہ کی حقیقت کا علم نہ ہو۔ تو اس کی نماز نہیں ہوگی اسی طرح ایسا علم بھی بیکار ہے جس کے ساتھ عمل نہ ہو، اللہ تعالیٰ بھی ان علماء کی سخت مذمت کرتا ہے جو بے عمل ہیں اور انھیں علما کے زمرے سے خارج قرار دیتا ہے۔

جُود و سخا

جُود اور سخا میں ایک نازک فرق ہے، سخاوت کے متعلق یہ بھی ممکن ہے کہ سخی اس کا مظاہرہ کسی ذاتی غرض کے لئے کرے لیکن جود، سخاوت کا وہ مقام ہے جو غرض سے بالکل پاک ہوتا ہے اور اس کا مظاہرہ اپنے اور بیگانے کے امتیاز کے بغیر کیا جاتا ہے، ان دونوں کی مثالیں دو جلیل القدر پیغمبروں کی زندگی میں ملتی ہیں، ایک کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں اور دوسرے کی مثال ہمارے آقا و مولا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں، احادیث میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک کوئی چیز تناول نہ فرماتے

تھے، جب تک کوئی مہمان آپ کے دستر خوان پر نہ آجاتا تھا، ایک بار ایسا ہُوا کہ تین دن گذر گئے۔ اور کوئی مہمان نہ آیا، اتفاق سے ایک آتش پرست آپ کے دروازہ کے سامنے سے گذرا، آپ نے اسے آواز دی اور اس کا حال دریافت کیا، جب معلوم ہُوا کہ یہ آتش پرست ہے تو فرمایا کہ میں مشرک کو اپنا مہمان بنانے کا مستحق نہیں سمجھتا، اس پر اللہ تعالےٰ نے آپ پر اظہارِ ناراضگی فرمایا کہ میں تو ستر سال سے اسے رزق دے رہا ہوں اور تو اسے ایک وقت کی روٹی نہ دے سکا۔ دوسری مثال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ جب حاتم طائی کا بیٹا حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کے لئے اپنی چادر بچھائی، اور اس پر اسے بٹھایا، پھر آپ نے صحابہؓ سے فرمایا، کہ جب تمہارے پاس کسی قوم کا سخی اور معزز شخص آئے تو اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عزت و تکریم سے پیش آیا کرو، پہلی مثال حضرت ابراہیمؑ کی تھی کہ آپ نے سخاوت میں مسلم و کافر کا امتیاز روا رکھا، یہ سخاوت کی مثال ہے۔ دوسری مثال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ آپ نے مومن و کافر کا امتیاز روا نہ رکھا یہ مثال جود کی ہے۔ معلوم ہوا کہ جود سخا سے افضل ہے۔

میں نے ایک حکایت پڑھی ہے کہ نیشاپور میں ایک سوداگر رہا کرتا تھا

جو اکثر حضرت ابو سعیدؒ کی مجلس میں بیٹھتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک فقیر حضرت ابو سعیدؒ کی خدمت میں آیا، اور اپنی ضرورت بیان کی، اس وقت سوداگر بھی موجود تھا۔ اس نے سوچا کہ میرے پاس ایک دینار اور سونے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے لاؤ اس میں سے ایک چیز اس فقیر کو دے دوں، پہلے خیال آیا کہ دینار دے دوں، پھر سوچا کہ یہ بہت زیادہ قیمت کا ہے، سونے کا ٹکڑا دے دوں، یہ اس سے کم قیمت ہے۔ چنانچہ اس نے سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا فقیر کو دے دیا۔ جب فقیر چلا گیا تو سوداگر نے حضرت ابو سعیدؒ سے دریافت کیا کہ اے شیخ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالےٰ سے جھگڑا کرے؟ حضرت ابو سعیدؒ نے فرمایا، ہاں ممکن ہے، کیا ابھی تو نے خدا سے جھگڑا نہیں کیا کہ اس نے تجھے دینار دیا، اور تو نے اس سے کمتر چیز سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا خیرات کیا۔

معلوم ہوا کہ سخاوت کی صحیح تعریف یہ ہے کہ خدا کی راہ میں بہتر سے بہتر چیز دی جائے، سخاوت کا اس سے بھی بہتر نمونہ سیّدنا حضرت امام حسنؓ نے دکھایا، جب ایک شخص آپ کے درِ دولت پر حاضر ہوا اور سوال کیا کہ اے فرزندِ رسولؐ! مجھے چار سو درہم عنایت فرمایئے، آپ نے فوراً غلام کو طلب کیا۔ جب وہ آیا تو اسے ہدایت فرمائی کہ اسے

چار سو درہم دے دو۔ چنانچہ اس نے چار سو درہم کی رقم لاکر آپ کی خدمت میں پیش کی، آپ نے وہ رقم اس کو دیدی، اور خود بہ ایں حالت گھر میں داخل ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، جب آپ سے رونے کا سبب پوچھا گیا تو آپؒ نے فرمایا کہ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں نے اسے سوال کرنے کا موقع کیوں دیا، کیوں نہ اسے بغیر مانگے دے دیا،

سخاوت کا اس سے بھی اونچا معیار آقائے نامدار سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا :-

چنانچہ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز حضورؐ کے پاس اسّی ہزار درہم کی رقم آئی۔ آپ نے وہ ساری رقم ایک گودڑی پر ڈلوادی اور اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھے جب تک کہ ایک ایک درہم تقسیم نہ ہو گیا، حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے سخاوت کا یہ مظاہرہ اس وقت فرمایا کہ جب آپ کے شکم مبارک پر بھوک کی وجہ سے پتھر بندھا ہوا تھا۔

حقیقتِ نفس

لغت کی رو سے نفس کے معنی ہیں کسی چیز کی ذات یا اس کا وجود لیکن مختلف علما نے اپنے اپنے رنگ میں اس کے مختلف معانی بیان کئے

ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ نفس کے معنی ہیں رُوح۔ بعض کے نزدیک رُوح سے مراد جسم ہے۔ بعض اس سے مراد ضمیر لیتے ہیں، لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا اظہار نفس ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور یہ دو صورتوں میں ہوتا ہے۔ اوّل نیکی کی صورت میں اور دوم بدی کی شکل میں۔ بدی اخلاقِ رذیلہ کا نام ہے۔ جیسے تکبر، حسد، بخل، غصہ، بغض، کینہ اور غیبت وغیرہ، ان تمام بُرائیوں کو ریاضت و مجاہدہ سے دُور کرنا چاہیئے۔ اگر غور کرو تو نفس اور رُوح دونوں درحقیقت ایک ہی لطیف چیز کے نام ہیں۔ اور اگر کہو کہ پھر ایک لطیف چیز سے خیر اور شر جیسی دو متضاد کیفیات کا ظہور کیا معنی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک ہی ماحول میں شیاطین بھی موجود ہیں اور ملائکہ بھی اور ایک ہی ہستی (خدا تعالےٰ) سے صفتِ لطف وکرم بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور صفتِ قہر بھی۔

پس معلوم ہوا کہ نفس کے دو مقام ہیں۔ ایک مقام میں وہ نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے۔ یہ ملکوتی نفس ہوتا ہے جو ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت سے جلا پاتا ہے۔ نفس کا دوسرا مقام نفسِ امّارہ کہلاتا ہے، جو بدی اور اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی ترغیب دیتا ہے۔ اور اسی نفس کے خلاف جہاد تمام جہادات سے زیادہ افضل و اکمل ہے۔ کیوں کہ جہاد

بالسیف دوسروں کے خلاف ہوتا ہے، اور جہاد بالنفس خود اپنے خلاف ہوتا ہے۔

خود اللہ تعالےٰ نے بھی قرآنِ حکیم میں نفسِ امّارہ کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو نفسِ امّارہ کے خلاف مرہرِ پیکار رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کو ملامت کی ہے جو نفسِ امارہ کی پیروی میں احکامِ خداوندی اور ہدایاتِ رسولؐ کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

جب بندہ پر نفسِ امارہ کی مخالفت فرض کی گئی ہے تو اس کے لیئے ضروری ہوا کہ وہ نفس کی ماہیت بھی معلوم کرے تاکہ وہ اس کے خیر و شر سے باخبر ہو جائے۔ خود اللہ تعالےٰ نے بھی حقیقتِ نفس سے بے خبر رہنے والوں کو جاہل اور احمق بتایا ہے

سو معلوم ہونا چاہیئے علما کا ایک گروہ
نفس کو رُوح اور جسم دونوں کے مجموعے
پر مشتمل قرار دیتا ہے ---!

اہلِ سنّت والجماعت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان ایسی ہستی ہے جو اس کائنات کے نشیب و فراز سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس کی باطنی قوتیں تغیّراتِ زمانہ اور حیات و ممات سے اثر پذیر نہیں ہوتیں۔ پس

نفسِ انسانی بھی کسی وقت یا زمانہ سے وابستگی نہیں رکھتا،

اور محققین کا خیال ہے کہ انسان تین چیزوں سے مرکب ہے۔

رُوح

نفس ــــ اور

جسم

اور ہر جوہر کے لئے ایک عرض یعنی صفت کا وجود ضروری ہے۔ پس روح کے لئے یہ صفت عقل ہے۔ نفس کے لئے خواہشات ہیں۔ اور جسم کے لئے احساس ہے۔ اور نفس کا جہاد ان تینوں کے خلاف ہوتا ہے ؂

تمام شد

(کتبہ ایس. حامد علی. لاہور)